لواخ

(ناول)

اختر رضا سلیمی

میں نے موت کو صرف ایک مرتبہ قریب سے دیکھا تھا؛ اتنے قریب سے کہ اگر میں اُسے نہ مارتا تو آج زندہ نہ ہوتا؛ بے شک وہ شخص جس پر میں فتح پا چکا تھا اور مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاتا تب بھی۔

اب، جب کہ اس واقعے کو انتالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ میں اسی لمحے؛ جب میرا دشمن، جسے مارنے کے لیے میں نے طویل منصوبہ بندی کی تھی اور وہ میرے قدموں میں پڑا، میرے بابا کی بہادری کے واسطے دے کر، مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، یک دم ایک بزدل آدمی کی جون میں ڈھل گیا تھا اور میں نے اپنی بزدلی چھپانے کے لیے فوراً اس کے سینے میں، اسی سے چھینی ہوئی وہ تلوار گھونپ دی تھی، جو اسے سرکار نے انعام کے طور پر دی تھی۔

اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں لہراتے موت کے سایوں کے بارے سوچتے ہوئے، چھ سال پہلے تک میں کانپ اٹھتا تھا، جنھوں نے میری آنکھوں میں داخل ہو کر یک بہ یک حاجرہ بی بی کے ان حسین خدوخال کی جگہ لے لی تھی، جو اس سے پہلے کئی سال تک مجھے خیرہ کرتے رہے تھے۔

چھے سال پہلے ایسے ہی ایک چھاپے کے بعد، جب عبدل سمیت یہاں موجود تمام لوگ، عقبی جنگل کی طرف بھاگ گئے تھے، موسمی بخار میں پھنکتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر میں نے اپنے ماضی سے جان نہ چھڑائی تو میں کسی بھی وقت پھانسی پر لٹکایا جا سکتا ہوں۔ مجھے اپنے اُس شاندار ماضی کو، جس کے بارے میں سوائے عبدل کے کسی کو پتا نہیں، مٹانے کا بہت افسوس ہے لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو آج میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔

لواخ

اختر رضا سلیمی

نوٹ

اس ناول کے بیشتر مقامات، کردار اور واقعات حقیقی ہیں کسی بھی قسم کی عدم مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

لواخ

اختر رضا سلیمی

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

نام کتاب	:	لواخ
مصنف	:	اختر رضا سلیمی
ٹائٹل	:	وصی حیدر
اہتمام	:	ارشد ملک
اشاعت اول	:	2023
تعداد کتب	:	1000
کمپوزنگ	:	سجاد احمد، عابد محمود
مطبع	:	فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

قیمت: 500 روپے

ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرر رسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ، مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو از راہِ کرم مطلع فرمائیں۔ انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ادارہ)

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

اقبال مارکیٹ اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی Ph:051 - 5551519

ڈسٹری بیوٹرز / اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک اقبال روڈ راولپنڈی فون: 051-5531610

اباجی (سردار شیر زمان)

اور

بے جی (قدرت بیگم)

کے نام

غبارِ جسم اگر درمیاں سے ہٹ جاتا

تو رفتگاں کو سہولت سے دیکھ سکتا میں

اسی قلم سے

شاعری:

- اختراع 2003
- ارتفاع 2008
- خواب دان 2013

ناول:

- جاگے ہیں خواب میں 2015
- جندر 2017
- لواخ 2023

ایک

میں جو آج یہاں کوہِ ناڑہ کی سب سے بلند و بالا چوٹی پر موجود، ایک وسیع میدان کے مغربی کنارے پر واقع، سبز گنبد والے مزار سے ملحق کاہو کے صدیوں پرانے درختوں کے جھنڈ میں موجود چلہ گاہِ حضرت سید محمد خان کے، درجن بھر کمروں میں سے ایک میں لیٹا، بظاہر مست الست اور درحقیقت پیاس سے نڈھال، چھت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں اور مجھ میں اتنی بھی طاقت نہیں ہے کہ اٹھ کر باہر کا جائزہ لے کر یہ معلوم کر سکوں کہ آیا چلہ گاہ کے صحن میں رکھے گھڑوں میں سے کوئی گھڑا سلامت ہے یا نہیں، کسی دور میں، ایک کڑیل جوان تھا؛ ایک ایسا جوان، جس نے اپنے جنگجو باپ کی بہادری کی لاج رکھتے ہوئے، انگریز سرکار کے ایک وفادار کو، جسے سلام نہ کرنا بھی، سرکار کی توہین سمجھا جاتا تھا، سرکار ہی کی طرف سے، اسے عطا کی گئی اعزازی شمشیر سے نہ صرف قتل کیا تھا بلکہ اس کے سینے میں تلوار گھونپنے سے پہلے، اس کی آنکھوں میں موت کے وہ سائے بھی دیکھے تھے، جو بعد ازاں تینتیس سال تک میرا پیچھا کرتے رہے تھے اور جن سے میں نے چھے سال پہلے، اماوس کی ایک رات، یہاں اسی بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر لواخ روشن کر کے، ہمیشہ کے لیے جان چھڑائی تھی۔

عبدل نے گیارہ سال پہلے، جب میری اور اس کی ملاقات ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے، مجھے بتایا تھا کہ اُن دنوں، جب اس واقعے کی رپورٹ یہاں کے تھانے میں درج ہوئی تھی تو، اِن سپاہوں کے پیش رو میرے نام سے تھر تھر کانپتے تھے، جن کے خوف سے اِس وقت مزار کا احاطہ اور اس سے ملحق چلہ گاہ کے کمرے، جن میں ابھی پانچ دن پہلے منعقد ہونے والے عرس کے موقع پر تل دھرنے کی

بھی جگہ نہیں تھی، ویرانی میں اُس بستی کا نظارہ پیش کر رہے ہیں، جس کی گلیوں میں میرا بچپن گزرا تھا اور اب اُسے اجڑے انتالیس سال گزر چکے ہیں۔

گرفتاری کے خوف سے، یہاں سے بھاگ کر قریبی جنگل کی کھائیوں میں پناہ لینے والے سارے لوگ جانتے ہیں کہ وہ، وہ نہیں جن کی اِن سپاہیوں کو تلاش ہے؛ اس پر مستزاد یہ کہ وہ سپاہی، جنھوں نے انھیں پکڑنے کے لیے یہاں چھاپہ مارا تھا، وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جنھیں ہم گرفتار کرنے آئے ہیں، وہ، وہ نہیں ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے۔

جب بھی علاقے میں کوئی واردات ہوتی ہے تو یہاں سے میل بھر کے فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں واقع تھانے میں ایک تھرتھلی سی مچ جاتی ہے۔ راتوں رات قریبی بستیوں میں چھاپے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں اگر مجرم پکڑے جائیں تو ٹھیک لیکن اگر ان کے ہاتھ کوئی مجرم نہ آئے تو وہ اِدھر کا رخ کرتے ہیں جہاں عموماً وہ لوگ قیام پذیر ہوتے ہیں، جن کا میری طرح کوئی آگا پیچھا نہیں ہوتا یا وہ اپنوں کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان سے جان چھڑا کر سکون کی تلاش میں یہاں آ جاتے ہیں، جہاں اُنھیں لنگر سے مفت دال روٹی بھی مل جاتی ہے اور چرس، افیون اور بھنگ بھی کہ یہ اس علاقے کا واحد مزار ہے، جہاں لوگ بھنگ، چرس اور افیون کے چڑھاوے بھی چڑھانے آتے ہیں۔ یہ بات مقامی انتظامیہ کے علم میں ہے لیکن سرکار کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔

ہاں جب کبھی کسی واردات کے مجرم ہاتھ نہیں آتے تو پولیس ادھر کا رخ کرتی ہے تاکہ نگ پورے کر کے حکامِ بالا کو یہ اطلاع دی جا سکے کہ ملزم گرفتار ہو چکے ہیں اور اُن سے معاملے کی تفتیش جاری ہے۔ دورانِ تفتیش بیشتر لوگ اُس جرم کا اعتراف کر لیتے ہیں، جو انھوں نے نہیں کیا ہوتا؛ اُنھیں معلوم ہوتا ہے کہ کئی کئی گھنٹے تھانے کی چھت سے الٹا لٹکے رہنے، چوتڑوں پر ڈنڈے کھانے اور نازک حصوں پر تشدد سہنے سے، جس سے وہ اپنی مردانگی تک سے ہاتھ دھو سکتے ہیں، کہیں بہتر ہے کہ سال چھ مہینے کے لیے جیل کی ہوا کھا لی جائے، دال روٹی تو وہاں بھی ملتی رہے گی کہ گورا اس معاملے میں بہت سخی ہے اور باہر بے شک سارا ملک بھوکا مر جائے، جیل میں کوئی بھوک سے نہیں مرتا۔

لواخ

ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھیں جائے وقوعہ کے حدود اربعہ کا سرے سے علم ہی نہیں ہوتا؛ تاہم گرفتاری کے بعد، پولیس انھیں سارا حدود اربعہ سمجھا دیتی ہے اور وہ عدالت میں، اپنا رٹا رٹایا وہ بیان دے دیتے ہیں، جسے محرر نے اپنی طرف سے لکھ کر، اس پر، ان کے انگوٹھے کا نشان ثبت کرالیا ہوتا ہے تاکہ عدالت کو مطمئن کیا جاسکے کہ یہ بیان اُسی شخص کا ہے، جس سے اسے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ بات مجھے عبدل نے بتائی تھی، جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزارا ہے اور دو مرتبہ، اُن معمولی جرائم کی پاداش میں حوالات کی ہوا کھا چکا ہے، جن کی جائے وقوعہ اس نے سزا کاٹنے کے بعد بھی نہیں دیکھی؛ یہ الگ بات ہے کہ انتالیس سال پہلے وہ اُس جرم سے باعزت بری ہوگیا تھا جو اُس نے واقعی کیا تھا۔

''باواجی میرا بہت جی چاہتا ہے میں اس جگہ کو مرنے سے پہلے ایک مرتبہ ضرور دیکھوں، جہاں، تھانے میں درج رپورٹ کے مطابق؛ میں نے دو دفعہ ایک ہی نوعیت کی واردات ڈالی تھی، لیکن یہ اس تھانے کی حدود کا آخری گاؤں ہے، جو سامنے والے پہاڑ کی چوٹی کے دوسری جانب ہے، جس کے راستے، سنا ہے، اس سے کہیں زیادہ پر پیچ ہیں جتنے یہاں کے ہیں اور وہاں تک جانے کے لیے مجھے کئی گھنٹے سفر کرنا پڑے گا، جس کی اب مجھ میں ہمت نہیں۔'' عبدل نے، جب وہ جیل جانے کی کہانی مجھے سنا چکا تھا، مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

وہ کہا کرتا ہے کہ گورے خود بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ تمیز سے بات کرتے ہیں لیکن ان کے یہ سانولے ملازم، بہت حرامی ہوتے ہیں۔ اس کے بقول؛ میرا جن گوروں سے پالا پڑا ہے انھوں نے ہمیشہ مجھ سے اچھے لہجے میں بات کی، یہاں تک کہ اس جج نے بھی، جس نے مجھے سزا سنائی تھی، بس مجھ سے اتنا ہی پوچھا تھا کہ تم پر جو الزامات لگے ہیں، ان کا اعتراف کرتے ہو اور میں نے فوراً ہاں کر دی تھی کہ تھانے دار نے مجھے یہی تلقین کی تھی اور وہ خاموشی کے ساتھ، کاغذ پر دستخط کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ذرا بھی نہیں دھمکایا، جیسے یہ ہمارے ہم شکل لوگ، جو ان کے ملازم ہیں، ہر شخص کو دھمکاتے پھرتے ہیں۔ اس کی یہ سادہ لوح باتیں جب بھی مجھے یاد آتی ہیں، میں مسکرائے بغیر نہیں رہتا حالاں کہ اب وہ اتنا بھی سادہ نہیں رہا، اس پورے مزار کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی اجازت کے بغیر

لواخ

یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی؛ سپاہیوں کی بات الگ ہے کہ وہ انگریز سرکار کے سپاہی ہیں، جو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔

میں نے اس نوع کی اب تک جتنی بھی کہانیاں سنی ہیں، ان سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہاں سے جو لوگ پکڑے جاتے ہیں اور تھانے میں اعتراف کر لیتے ہیں، ان میں سے بہت کم بری ہوتے ہیں کہ پولیس ان کا اعترافی بیان لینے کے بعد وقوعے کی کارروائی کا اندراج کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھتی ہے کہ اس میں کوئی لکونا نہ رہ جائے، اور اس شخص کو، جس نے یہ جرم نہیں کیا ہوتا، عدالت کی طرف سے شک کا فائدہ نہ مل سکے؛ شک کا فائدہ وہ صرف ان لوگوں کو دلواتی ہے، جنھوں نے واقعی کوئی جرم کیا ہوتا ہے، اور جن سے اسے بھاری نذرانہ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

ولایتی سرکار کے یہ سپاہی اپنے تھانے داروں سمیت، سب کے سب دیسی ہیں؛ ان کے قد بت، رنگت، چہرے مہرے، ڈاڑھیاں (اگر ہوں) اور بل کھاتی مونچھیں بالکل ویسی ہی ہیں، جیسی یہاں کے ان باشندوں کی، جن میں سے کچھ کو گرفتار کرنے، وہ تھوڑی دیر پہلے یہاں آئے تھے۔

جس طرح ہمیں یہ چٹی چمڑے والے گورے، جو ہمارے حکمران ہیں، شکل سے ایک جیسے ہی لگتے ہیں اور ہم صرف ان کے کاندھے پر لگے چاندی کے پھولوں اور سینے پر سجے مختلف النوع اور مختلف رنگوں کے تمغوں ہی سے ان میں تمیز کر سکتے ہیں بالکل اسی طرح ہم لوگ بھی انھیں یقیناً ویسے ہی ایک دوسرے سے مماثل دکھائی دیتے ہوں گے اور ان کے لیے ہم لوگوں میں تمیز کرنا، اتنا ہی مشکل ہوتا ہوگا، جتنا اُس شخص کے لیے بھیڑوں میں؛ جس نے کبھی انھیں پالا پوسا نہ ہو اور محض دور سے انھیں کسی چراہ گاہ میں چرتے ہوئے دیکھا ہو۔ حالاں کہ چرواہا، نہ صرف ہر بھیڑ کو دوسری سے ممیز کر سکتا ہے بلکہ اس نے سینکڑوں بھیڑوں کے علاحدہ علاحدہ نام بھی رکھے ہوتے ہیں اور جب کوئی بھیڑ اس کے گلے سے الگ ہو کر کسی کھیت میں منہ مارنے کو دوڑتی ہے تو وہ اسے، اس کا باقاعدہ نام لے کر شُشکارتا ہے اور وہ اپنا نام سن کر رک جاتی ہے کیوں کہ وہ جان رہی ہوتی ہے کہ چرواہا اُسی کو پکار رہا ہے اور اگر وہ نہ رکی تو اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شہتوت کی پتلی اور لچکیلی چھانٹ، اُس کا جسم ادھیڑ کر رکھ دے گی۔

لواخ

ان ولایتیوں کو بھی ہم دیسی لوگ، بھیڑوں کی طرح، ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں؛ شک کی نظر سے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی، جو ان کے ملازم ہو کر، ان کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔

وہ ہم سب ہندوستانیوں کو چاہے وہ ہندو ہوں، سکھ ہوں یا مسلمان ایک ہی نظر سے دیکھتے اور ایک ہی سوٹی سے ہانکتے ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی ہندو اس وجہ سے مسلمان سے مختلف نہیں ہو جاتا کہ وہ سر پر ٹوپی رکھنے کے بجائے ماتھے پر تلک لگاتا ہے؛ وہ مندر جاتا ہے اور بتوں کی پوجا کرتا ہے اور مسلمان مسجد میں ماتھا ٹیکتا ہے؛ یا مسلمان کی ڈاڑھی ترشی ہوئی ہوتی ہے اور سکھ ناتراشیدہ ڈاڑھی، ہوا میں لہراتا پھرتا ہے۔

ان کے نزدیک ہندوستان میں صرف دو طرح کے لوگ بستے ہیں؛ ایک دیسی اور دوسرے وہ خود۔ سو ان پر اعتبار کرنا، انھیں اپنے برابر لا بٹھانے کے مترادف ہے؛ جس کا اظہار، ان کی مخصوص عمارتوں کے دروازوں پر لگی تختیوں سے ہوتا ہے، جن پر یہ عبارت جلی حروف میں لکھی ہوتی ہے:

''یہاں دیسیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔''

حالاں کہ میں نے سنا ہے کہ کتے رات کو، ان کی بیویوں کے ہمراہ، ان کے بستروں میں سوتے ہیں۔

تھوڑی دیر پہلے یہ جو چند سپاہی کاچھے پہنے یہاں آئے تھے اور انھوں نے ٹھڈا مار کر میرے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور میرے محمدی بسترے پر یوں چڑھ دوڑے تھے جیسے انھیں کسی نے پیچھے سے دھکا دے دیا ہو، اور سامنے مجھے، یعنی اُسی ملنگ متانے کو پا کر، جسے وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہوئے واپس پلٹ گئے ہیں، نہیں جانتے کہ ان کے آقا، انھیں بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جس نظر سے وہ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں، جن کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے۔

''لگتا ہے وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔'' ان کے یہاں پہنچنے سے، تقریباً چوتھائی گھنٹا پہلے، میرے کانوں میں جوں ہی عبدل کی آواز گونجی تھی، جو کسی دوسرے شخص سے مخاطب تھا، میں نے اس بات کا

لواخ

انداز ہ لگا لیا تھا کہ یہاں سے میل بھر کے فاصلے پر موجود تھانے میں کوئی نیا تھانے دار آگیا ہے اور اس نے اپنے بڑوں کو خوش کرنے اور اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے پکڑ دھکڑ شروع کر دی ہے، جیسے اس سے پہلے یہاں کا ہر تھانے دار کرتا آیا ہے۔ گذشتہ گیارہ برسوں سے، جب سے میں یہاں مقیم ہوں اس طرح کے درجنوں چھاپے پڑ چکے ہیں اور مجھے سوائے دو مرتبہ کے؛ ہر بار سادھو، سنت یا فقیر سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ گیارہ سال پہلے؛ جب میں یہاں نیا نیا آیا تھا اور پہلے ہی چھاپے میں دھر لیا گیا تھا اور دوسری مرتبہ؛ چھے سال پہلے، جب مجھے لواخ روشن کر کے لوگوں کو انگریز سرکار کے خلاف حملے پر اکسانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ دونوں مرتبہ تھانے دار نے، مجھے دیکھتے ہی ایک ہی فقرہ اچھالا تھا۔ ''یہ پاگل کہاں سے اٹھالائے ہو، میں نے اس کا اچار ڈالنا ہے۔'' اس کے بعد کبھی مجھے گرفتار نہیں کیا گیا۔

اب تو خیر میں نے سرکاری کاغذات میں بھی، اپنا نام مستانہ خان ولد منگتا خان، قوم فقیر اور پیشہ گدا گر لکھوا دیا ہے اور سند کے طور پر بابا کی اس بوسیدہ پگڑی کو، کاسہ ءگدائی کے طور پر استعمال کرنا شروع دیا ہے؛ جو انھوں نے اپنے آخری محاذ جنگ پر جانے سے پہلے، مجھے اُس تلوار کے ساتھ سونپی تھی، جس سے انھوں نے سکھوں کے ایک مرد جری امر سنگھ مجیٹھیہ کو قتل کیا تھا۔

❖

میں نے دروازہ کھولے بغیر، صرف عبدل کے اس فقرے سے انداز ہ لگا لیا تھا کہ سپاہی اب اس جگہ پہنچنے والے ہیں، جہاں سے بل کھاتا راستہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ایک شاخ موڑ کاٹ کر اس مرکزی راستے کی طرف چلی جاتی ہے، جو اس تھانے کی حدود میں واقع مختلف بستیوں کو آپس میں ملاتا ہے اور دوسری سیدھی کوہ ناڑہ کی اس چوٹی کی طرف آنکلتی ہے، جہاں سبز گنبد والے مزار سے ملحق چلہ گاہ کے بارہ کمروں میں سے ایک میں لیٹا، میں اپنے اُس ماضی کو کرید رہا ہوں، جو میرے حالِ خستہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاندار تھا، اور جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے اُسے پتھروں سے بنے تنور نما، اُس لواخ کے شعلوں میں جھونک دیا تھا، جس کا روشن ہونا میرے باپ دادا کے دشمنوں کے لیے خطرے کی علامت ہوا کرتا تھا۔

لواخ

میدان کے شمالی نشیب میں جنگل ہے، جس میں گہری کھائیاں ہیں، جنگل اتنا گھنا اور بڑا ہے کہ اس میں سپاہی بھی داخل نہیں ہوتے کہ انھیں خود اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہاں سے فرار ہونے والے سارے لوگ، ایک انتہائی دشوار گزار پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے اسی جنگل کی طرف گئے ہوں گے، جہاں کی گہری کھائیوں کے بیچ بنے ہوئے غار، ان کی جائے امان ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جو بھی ان میں پہنچ گیا وہ سرکاری کارندوں کی پہنچ سے دور ہو گیا۔

جب مجھے ان لوگوں کے دشوار گزار جنگلی کھائیوں کی طرف بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی تو میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان سپاہیوں کا رخ اِسی مزار کی جانب ہے لیکن پیاس کی شدت کے باوجود، جو مجھے ہمیشہ محمد خان ترین کی یاد دلا دیتی ہے کہ اس کے پیاس کی شدت سے مرنے کی کہانی میں نے بچپن میں اتنی بار سنی ہے کہ میں شدتِ تشنہ لبی کے بغیر موت کا تصور کر ہی نہیں سکتا، مجھے ان سے کوئی ایسا خطرہ محسوس نہیں ہوا، جیسا چھ سال پہلے اس وقت ہوا تھا، جب ان کے یہاں اسی کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بابا کا نوشتہ، اپنی رانوں میں داب کر کمبل اوڑھ لیا تھا تا کہ اُس پر ان کی نظر نہ پڑ سکے۔

وہ لوگ؛ جو اس تھانے کی حدود میں شامل کسی علاقے میں کوئی ایسا کام کر کے فرار ہو گئے، جو مروج قانون کے مطابق قابل دست اندازیِ قانون تھا اور جن کے یہاں موجود ہونے کے شبے کا بہانہ بنا کر مزار پر چھاپا مارا گیا ہے تا کہ اس کا الزام ان پر ڈال کر اپنی جان خلاصی کی جائے؛ ان کے بارے میں، میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون ہیں؟ اور اس وقت کہاں ہوں گے؟ لیکن جہاں بھی ہوں گے، انھیں پہچاننا اور پکڑنا مشکل ہو گا۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں یا میں نے ان کے بارے میں کسی سے سن رکھا ہے؛ میں تو ان میں، یعنی ان نامعلوم لوگوں میں، اپنی جوانی دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے ہو بہو اپنی جوانی کی تصویر نظر آتے ہیں؛ اس جوانی کی تصویر، جس میں گوروں کے یہ مقامی سپاہی، میری تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے اور آج تک مجھے پکڑ نہیں پائے۔

ہاں یہ ضروری نہیں کہ ان مفروروں کا بڑھاپا بھی میری طرح کسی مزار کے احاطے میں ایک ملنگ کی شکل میں لیٹے ہوئے گزرے؛ ہو سکتا ہے وہ مجھ جتنے چالاک نہ ہوں اور کسی دن پکڑے جائیں

اور ان میں سے کچھ کو، اگر انھوں نے بغاوت جیسا کوئی سنگین جرم کیا ہے، بالکل اسی طرح توپوں سے اڑا دیا جائے، جیسے آج سے انتالیس سال پہلے، بائیس لوگوں کو مری پر حملہ کرنے کی پاداش میں اڑایا گیا تھا، جن میں میرے بابا بھی شامل تھے۔

میرے دادا کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی بالاکوٹ کے معرکے میں کام آ گئے تھے ورنہ ان کا انجام بھی اپنے بیٹے سے مختلف نہ ہوتا؛ اگر وہ بڑھاپے کی وجہ سے عملی طور پر جنگ میں حصہ نہ بھی لیتے تو بھی اپنے ماضی کی بنیاد پر، ان کے خلاف حملے پر اکسانے کا جرم بہرحال ثابت ہو جاتا اور یہ جرم سرکار کی نظر میں عملی طور پر حملہ کرنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ دوسری صورت میں انھیں اپنے دوسرے بیٹے آزاد خان کی طرح ان کے بیوی بچوں کے سامنے بندوق کی گولیوں سے بھون دیا جاتا؛ وہ بہرحال حسن علی خان نہیں تھے، جن پر بغاوت کا جرم ثابت ہونے کے باوجود مقدمہ نہیں چلایا جا سکا تھا کہ انگریز سرکار کو ان کی موت سے ایک اور بغاوت پھوٹنے کی بو آنا شروع ہو گئی تھی اور انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کے بجائے، سرکار کو؛ ان کی طرف سے مستقبل میں کسی ممکنہ حملے کا سدباب کرنے کے لیے، ان کی ریاست کی سرحد پر چھ چھاؤنیاں قائم کرنا پڑیں۔

موت تو برحق ہے اس نے ہر صورت آنا ہے؛ وہ اس کمرے میں، اس آرام دہ بستر پر بھی آ سکتی ہے، جو عبدل نے میرے لیے خصوصی طور پر اپنے گاؤں سے منگوایا تھا لیکن مجھ سمیت، گرم بستروں میں مرنے والے لوگ اُس سرگرم اور پرجوش موت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، جس کا سامنا آدمی کو میدان جنگ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنا پڑتا ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ ایک لمحے کی غفلت اسے ہمیشہ کی نیند سلا سکتی ہے، یہی آگہی اسے مدِمقابل پر حاوی رکھتی ہے۔ اس سمے اس کی رگوں میں خون کے بجائے ایک جوش اور جذبہ گردش کر رہا ہوتا ہے، جو اسے بڑھ کر وار کرنے پر اکساتا ہے اور وہ بسا اوقات اپنے سے کئی گناہ طاقت ور دشمن کو بھی پچھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میرے قبیلے کی تاریخ اس نوع کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

میں نے موت کو صرف ایک مرتبہ قریب سے دیکھا تھا؛ اتنے قریب سے کہ اگر میں اُسے نہ

مارتا تو آج زندہ نہ ہوتا؛ بے شک وہ شخص جس پر میں فتح پا چکا تھا اور مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاتا تب بھی۔

اب، جب کہ اس واقعے کو انتالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ میں اسی لمحے؛ جب میرا دشمن، جسے مارنے کے لیے میں نے طویل منصوبہ بندی کی تھی اور وہ میرے قدموں میں پڑا، میرے بابا کی بہادری کے واسطے دے کر، مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، یک دم ایک بزدل آدمی کی جون میں ڈھل گیا تھا اور میں نے اپنی بزدلی چھپانے کے لیے فوراً اس کے سینے میں، اسی سے چھینی ہوئی وہ تلوار گھونپ دی تھی، جو اسے سرکار نے انعام کے طور پر دی تھی۔

اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں لہراتے موت کے سایوں کے بارے سوچتے ہوئے، چھ سال پہلے تک میں کانپ اٹھتا تھا، جنھوں نے میری آنکھوں میں داخل ہو کر یک بہ یک حاجرہ بی بی کے ان حسیں خدوخال کی جگہ لے لی تھی، جو اس سے پہلے کئی سال تک مجھے خیرہ کرتے رہے تھے۔

چھے سال پہلے ایسے ہی ایک چھاپے کے بعد، جب عبدل سمیت یہاں موجود تمام لوگ، عقبی جنگل کی طرف بھاگ گئے تھے، موسمی بخار میں پھنکتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر میں نے اپنے ماضی سے جان نہ چھڑائی تو میں کسی بھی وقت پھانسی پر لٹکایا جا سکتا ہوں۔ مجھے اپنے اُس شاندار ماضی کو، جس کے بارے میں سوائے عبدل کے کسی کو پتا نہیں، مٹانے کا بہت افسوس ہے لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو آج میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔

دو

چھے سال پہلے کی ایک شام، جب انھوں نے آج ہی کی طرح ایک بھاری نفری کے ساتھ، یہاں دھاوا بولا تھا تو ان کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے سب سے پہلے اُس نوشتے کا خیال آیا تھا، جوان دنوں ہر وقت میرے سرھانے پڑا رہتا تھا۔ اس دن، ان کی آمد اتنی غیر متوقع تھی کہ عبدل کو یہاں اس کمرے میں آ کر، مجھے مطلع کرنے کی مہلت ہی نہ مل سکی اور وہ مجھے یہ بتائے بغیر کہ وہ یہاں پہنچنے والے ہیں، دوسروں کے ساتھ فرار ہوگیا تھا۔ مجھے ان کی آمد کا پتہ اس وقت چلا تھا، جب میں نے اس چلہ گاہ کی جنوبی سمت موجود پتھریلے زینے پر، ان کے بھاری بھرکم بوٹوں کے گھسٹنے کی آواز سنی تھی۔

میں نے اپنا منہ کمبل سے نکال کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تھی کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کرسکوں، جہاں نوشتے کو چھپایا جا سکے؛ جب مجھے کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دی تو میں نے جلدی سے اُسے اپنی رانوں کے بیچ اُڑس لیا تھا۔

اُس دن، مجھے خدشہ تھا کہ اگر وہ نوشتہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو میری شامت آجائے گی۔ ان میں ضرور کوئی ایسا شخص بھی ہوگا، جو فارسی لکھنا پڑھنا جانتا ہوگا اور جب وہ انھیں بتائے گا کہ اس کی چرمی جلد پر نوشتہ ءخانی زمان خان کے الفاظ کندہ ہیں تو قطع نظر اس کے کہ اس کے مندرجات کیا ہیں، وہ اسے فوراً ضبط کر کے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دیں گے۔

اگر میں نے جھوٹ بولا کہ مجھے یہ نوشتہ راستے میں کہیں پڑا ہوا ملا، یا میں نے اسے چلہ گاہ کے کتب خانے سے نکالا ہے تو تب بھی وہ خوش ہوں گے کہ ان کے ہاتھ ایک ایسی چیز لگ جائے گی، جس

کے مندرجات سے زیادہ، ان کے نزدیک اس بات کی اہمیت ہوگی کہ یہ ایک ایسے شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جو سرکار کے باغیوں میں سرفہرست تھا،لہٰذا اس میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوگی، جو ہمارے حاکموں کے کام کی ہوگی؛ اور اگر میں نے انھیں بتادیا کہ میں اسی خانی زمان خان کا بیٹا ہوں، جس نے یہ نوشتہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا تو ان کی خوشی قابل دید ہوگی، کہ اُن کے ہاتھ ایک ایسے شخص کا بیٹا آجائے گا، جس کا جرم اتنا سنگین تھا کہ اس پر کوئی عدالتی مقدمہ چلائے بغیر اسے توپ کے آگے باندھ کر، اس کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیے گئے تھے؛ اتنے بڑے مجرم کا بیٹا ہونا بذات خود ایک ناقابل معافی جرم ہے، یہ الگ بات ہے کہ اسے اس جرم کی سزا پائے مدتیں گزر چکی ہیں۔

مجھے جس تھانے دار کے سامنے پیش کیا جائے گا وہ بھی پہلے تھانے داروں کی طرح کوئی مقامی شخص ہی ہوگا، لیکن مجھے یقین ہے اس کا تعلق میرے قبیلے سے نہیں ہوگا کسی صورت بھی نہیں؛ کہ سرکار میرے قبیلے کے کسی بھی فرد پر بھروسہ نہیں کرتی۔ مجھے بہت پہلے پتہ چل گیا تھا کہ مقامی انتظامیہ نے جو رپورٹیں مرتب کر کے اعلیٰ حکام کو بھجوائی ہیں ان کے مطابق میرا قبیلہ؛ انتہائی چالاک، پرلے درجے کا دھوکے باز اور ناقابل بیان حد تک ناقابل اعتبار ہے، اس لیے اس کا کوئی بھی فرد کسی بھی سرکاری ملازمت کا اہل نہیں۔

اس علاقے سے فوج اور پولیس کی بھرتی کے وقت تو آج بھی اس بات کی باقاعدہ تصدیق کرائی جاتی ہے کہ کہیں متعلقہ شخص نے اپنی شناخت تو نہیں چھپائی اور اس کا تعلق درپردہ حسن علی خان کے قبیلے سے تو نہیں؛ اسی حسن علی خان کے قبیلے سے، جس کی جرات، بہادری، تدبر اور جنگی حکمت عملیوں سے، میرے باپ کا نوشتہ، جس سے میں نے چھے سال پہلے بڑی مشکلوں سے جان چھڑائی، بھرا پڑا تھا۔

چھے سال پہلے کی اُس رات، اُن کی آمد کے بارے میں سوچتے ہوئے، میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس نئے تھانے دار کا تعلق بھی پچھلے تھانے دار کی طرح، کسی ایسی برادری سے ہوگا، جنھیں اپنے دور میں، یہاں کے خوانین، مقدم اور سردار کمی کمین سمجھتے تھے اور انھیں سال بھر کی بے گار کے عوض صرف دو وقت کی روٹی اور دو جوڑے کپڑے دیتے تھے۔ وہ انتہائی خستہ اور ناگفتہ بہ مکانوں میں

رہتے تھے، جن کا کچا فرش بارش کے دنوں میں کیچڑ زدہ گلی کا نظارہ پیش کر رہا ہوتا تھا لیکن جوں ہی وقت نے پلٹا کھایا اور گوروں کا اقتدار مضبوط ہوا، ان لوگوں کی قسمت چمک اٹھی؛ اب وہی لوگ، ان لوگوں پر حکم چلا رہے ہیں، جن کے وہ کچھ عرصہ پہلے تک دست نگر تھے اور ان لوگوں سے چن چن کر بدلے لے رہے ہیں، جنھوں نے ان کے باپ دادا سے بے گار لی تھی۔ ویسے ان کا اتنا حق تو بنتا ہی ہے، ہمارے بزرگوں نے بھی تو انھیں صدیوں تک دبا کر رکھا؛ یہاں تک کہ انھیں اپنے برابر چار پائی پر بھی نہیں بیٹھنے دیا تھا۔

جب تھانے دار کو پتہ چلے گا کہ میرے پاس سے ایک ایسا نوشتہ برآمد ہوا ہے، جس پر نوشتۂ خانی زمان خان درج ہے تو وہ مجھ سے پہلے، نوشتے پر جھپٹے گا کیوں کہ اسے کامل یقین ہو گا کہ اس میں ضرور کوئی ایسی بات ہو گی، جس سے ہمارے حاکموں کو، ان اسباب کا کھوج لگانے میں مدد مل سکتی ہے، جو مری پر حملے کا باعث بنے تھے۔ انھوں نے تو اس واقعے کے بعد لوگوں کے گھروں سے وہ نجی رقعے بھی ضبط کر لیے تھے جو اس عرصے میں، انھوں نے اپنے عزیزوں کو لکھے تھے کہ شاید ان سے کوئی ایسا سرا ہاتھ آ جائے، جس سے اس حملے کے اسباب کی تہہ تک پہنچا جا سکے۔

یوں ہی ورق گردانی کرتے ہوئے کسی صفحے پر جب اس کی نظر حسن علی خان کے نام پر پڑے گی، جس کے ذکر سے یہ نوشتہ بھرا پڑا ہے، تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں گی؛ جنھیں دیکھ کر اس کے آس پاس کھڑے سپاہی خوش ہو کر آپس میں کھسر پھسر شروع کر دیں گے، انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ انھوں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے۔

حسن علی خان کا نام دیکھتے ہی تھانے دار کو اپنے کاندھے پر ایک اور پھول سجتا نظر آئے گا اور اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جائے گا لیکن جب وہ، اپنی نہ چھپا سکنے والی خوشی کے باعث، اپنے ساتھیوں کی کھسر پھسر سنے گا تو چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے، نوشتے سے سر اٹھا کر انھیں شاباش دے گا اور کہے گا کہ اس خوشی میں رات کا کھانا میری طرف سے۔ اس کو یہیں بٹھا دو میں اس سے پوچھ گچھ کر لوں امید ہے کوئی اچھی خبر آئے گی؛ اور وہ سارے اسی بات پر خوش ہو جائیں گے کہ صاحب خوش ہو گئے ہیں۔

ان میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جو ایک عرصے سے چھٹی کا متمنی رہا ہوگا لیکن کار سرکار زیادہ ہونے کی وجہ سے، اس کی چھٹی مسلسل التوا کا شکار ہوتی آئی ہوگی۔ وہ یہ سوچ کر پھولے نہیں سمائے گا کہ اب اس کی چھٹی پکی ہوگئی ہے اور وہ اسی لمحے اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے خواب دیکھنا شروع کر دے گا۔ اگر میرا شناسا کوئی پرانا سپاہی، تھانے دار کو بتائے گا کہ اسے ہم ایک مرتبہ پہلے بھی گرفتار کر کے لائے تھے اور اُس وقت کے تھانے دار صاحب نے اسے پاگل سمجھ کے چھوڑ دیا تھا تو وہ زوردار قہقہہ لگا کر کہے گا۔ ''پاگل یہ نہیں، وہ تھانے دار تھا، جس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔'' پھر وہ کچھ سوچے گا اور مجھے زیادہ مشکوک نظروں سے دیکھے گا؛ میرے حلیے سے، جسے دیکھ کر عام لوگ مجھے سادھو، سنت یا فقیر سمجھتے ہیں، وہ اندازہ لگائے گا کہ میں ضرور کسی دشمن کا کوئی جاسوس ہوں اور اس علاقے کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر موجود، مزار کے احاطے میں لیٹ کر انگریزوں کے خلاف جاسوسی کر رہا ہوں۔

وہ پہلے مجھ سے زبانی پوچھ گچھ کرے گا، اگر میں خاموش رہا، جس کا امکان ویسے بھی زیادہ ہے، تو میری خاموشی کو زبان دینے کے لیے مجھے تھانے کے چھت کی کڑی یا بالوں سے لٹکی رسیوں سے الٹا لٹکا دے گا۔ اگر اس کے باوجود بھی میں چپ رہا تو ڈنڈے پیر کو حاضر کرائے گا اور میں وہ سارے جرم اگل دوں گا، جو میں نے نہیں کیے؛ یہ اعتراف بھی کہ میں واقعی اس نوشتے کے خالق خانی زمان خان کا بیٹا ہوں، جسے اس کے کیے کی سزا تینتیس سال پہلے مل چکی ہے اور اب مجھ سمیت، اس کے وارثوں کو اس کی قبر (اگر اسے دفن کیا گیا) کے نشان کا بھی پتہ نہیں؛ البتہ میں اُس جرم کا اعتراف کسی صورت نہیں کروں گا، جو میں نے واقعی کیا تھا۔

ہاں اگر ان کی سرکاری یاد داشت نے کام کیا تو ان کے ہاتھ، انگریز سرکار کے ایک وفادار شخص کا قاتل بھی آجائے گا، جسے اُس نے، انھی کی طرف سے عطا کی گئی اعزازی شمشیر چھین کر، اس کے ٹوپی دار بندوق بردار محافظ سمیت، موت کے گھاٹ اتارا تھا اور برسوں پہلے تھانہ قائم ہونے کے فوراً بعد یہاں جو پہلی رپورٹ درج ہوئی تھی، وہ اسی شخص کے خلاف تھی، جس کی تلاش میں انھوں نے، اُن دنوں اس خطے کا چپہ چپہ چھان مارا تھا لیکن وہ ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا اور اب اپنی بدقسمتی اور اُن کی خوش قسمتی سے اسی

تھانے کی چھت سے الٹا لٹکا، دنیا جہان کے جرم اپنے کھاتے میں لکھوا رہا ہے۔

اگر اب بھی وہ کسی طرح پتہ چلا لیں کہ میں وہی شخص ہوں تو میری کم از کم سزا پھانسی ہوگی اور اگر میں ان دنوں گرفتار ہو جاتا، جن دنوں میں نے یہ جرم کیا تھا تو میں بھی اپنے باپ کی طرح توپ ہی سے اڑایا جاتا کہ یہ اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم تھا۔

❁

میں انھی سوچوں میں گم تھا کہ ایک زوردار آواز سے دروازہ کھلا، میں نے فوراً منہ پر سے کمبل سرکا لیا تھا تا کہ انھیں میری شناخت کے لیے کوئی تردد نہ کرنا پڑے ورنہ اگر وہ اس مقصد کے لیے خود میرے اوپر سے کھینچ کر کمبل اتارتے تو میری رانوں میں دبا نوشتہ ان کی نظروں میں آجاتا۔ میری تدبیر کارگر رہی تھی؛ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی، ان میں سے ایک نے، جو کافی عرصے سے اسی تھانے میں تعینات تھا، کہا تھا: ''وہی پاگل ہے۔''

مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ سب لوگ فرار ہو چکے ہیں اور میل بھر کی دوری سے، جو کوئی خاص دوری بھی نہیں، ان کا یہاں آنا اکارت گیا ہے۔ یہ اندازہ مجھے ان کے رویے سے ہوا تھا؛ وہ ان لوگوں کے یہاں سے فرار ہو جانے کا غصہ یہاں رکھے سامان پر اس طرح نکال رہے تھے جیسے فرار ہونے والوں پر فرض تھا کہ وہ ان کے انتظار میں یہاں بیٹھے رہیں اور کوئی جرم کیے بغیر، ان کے ساتھ تھانے چلیں اور اعتراف جرم کر کے جیل کی ہوا کھائیں تا کہ ان کی نوکری چلتی رہے۔

انھوں نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی تمام سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا؛ وہاں رکھی اشیائے خورونوش کو برتنوں میں سمیت سمیٹا اور مٹی کے وہ بھاری برتن، جنھیں اٹھا کر لے جانا مشکل تھا، توڑ کر چلتے بنے تھے۔ اُس دن بھی، آج کی طرح، جب وہ پانی سے بھرے گھڑے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخ رہے تھے تو لمحہ بھر کے لیے میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ ان سے درخواست کروں کہ خدارا پانی تو رہنے دیں، لیکن مجھے خوف تھا کہ وہ غصے میں مجھ پر جھپٹیں گے اور میری رانوں میں دبا وہ نوشتہ، ان کے ہاتھ لگ جائے گا، جس کا ان کے ہاتھ لگنا، میری موت تھی۔

تین

اس دن جب سپاہیوں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ اب یہاں صاحب مزار اور میرے علاوہ، جسے انھوں نے مجذوب سمجھ کر دفن شدہ ہی سمجھ رکھا تھا، کوئی بھی نہیں ہے تو انھوں نے سامان کی پوٹلیاں اٹھائیں اور پگڈنڈی اترنے لگے۔ میں نے کمرے کی مدھم روشنی سے اندازہ لگالیا تھا کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہے اور تھوڑی ہی دیر میں یہاں اندھیرا سرسرانے لگے گا۔اندھیرے کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان اچانک اُس لواخ کی طرف گیا تھا جسے آخری بار روشن ہوئے ان دنوں، سینتالیس سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا؛ وہی لواخ جس کے صدیوں سے رائج معانی کو، بابا نے حسن علی خان کے ساتھ مل کر، مری کی جنگ کے دنوں میں، جس میں ہمیں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، تاریخ میں پہلی بار بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن لواخ نے نئے معانی قبول نہیں کیے تھے اور بدستور بجھا پڑا رہا؛ تا آں کہ چھے سال پہلے کی اُس رات شدید سردی سے کانپتے اور بخار میں پھنکتے ہوئے میں نے اسے ایک بار پھر روشن کرنے کا منصوبہ نہیں بنالیا۔

اگر صبح سے عصر تک کے درمیان کا کوئی وقت ہوتا تو میں یہ امید رکھ سکتا تھا کہ اگر مزار کے احاطے میں رہائش پذیر لوگوں میں سے،کوئی واپس نہ بھی آیا تو بھی کسی نئے زائر کی آمد کی امید رکھی جاسکتی ہے اور وہ یقیناً کوئی نہ کوئی راشن چڑھاوے کے طور پر ضرور لائے گا کہ یہاں جو بھی شخص، کسی علاقے سے حاضری دینے آتا ہے، کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا۔

یہاں کا لنگر ایسے ہی زائرین کی عقیدت کی بدولت بارہ مہینے جاری وساری رہتا ہے یہاں تک

کہ بعض لوگ، یہاں کے بندروں، بطوں، بلیوں، مرغوں، کبوتروں اور موروں وغیرہ کے لیے بھی کھانے پینے کی اشیا ساتھ لے کر آتے ہیں، لیکن ایسے زائر یہاں صرف عصر سے پہلے پہلے ہی آتے ہیں تا کہ سورج غروب ہونے تک وہ کم از کم نشیب میں موجود، اس بستی کے کھنڈرات تک ضرور پہنچ جائیں، جو میرے باپ دادا کا مسکن رہی ہے، جن میں سے ایک یہاں، اس پہاڑ کی چوٹی پر دفن ہے لیکن یہ بات یہاں مقیم لوگوں میں سے صرف عبدل جانتا ہے اور مجھ سے اس کی عقیدت کا سبب بھی یہی صاحب مزار ہیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے آج ایک مرتبہ پھر، اپنے دادا کی ہمسائیگی میں اکیلے رات گزارنا ہوگی۔ میں نے پہلے بھی یہاں کئی راتیں اکیلے بسر کی تھیں لیکن وہ رات، جندر کی رات کی طرح، مجھ پر اس لیے بھاری تھی کہ میں گذشتہ تین دنوں سے بخار میں پھنک رہا تھا اور میں نے آٹھ پہر سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ سپاہیوں کے دھاوا بولنے سے کوئی دو گھنٹے پہلے عبدل نے بنفشے اور پودینے کا قہوہ بنا کر مجھے زبردستی پلایا تھا، جس سے میرے بدن میں تھوڑی سی حرارت پیدا ہوئی تھی۔ اس نے میرے لیے کھچڑی بھی بنائی تھی لیکن اس وقت میرا جی نہیں چاہ رہا تھا اور باوجود اس کے اصرار کے، میں ایک نوالہ بھی گلے سے نہیں اتار سکا تھا۔

اس نے وہ کھچڑی یہاں میرے کمرے میں رکھ دی تھی تا کہ جب میرا کھانے کو جی چاہے تو کھا سکوں، لیکن جب سپاہی میرے کمرے کی چیزیں اتھل پتھل کر رہے تھے اور ان کی نظر اس پر پڑی تو ان میں سے ایک نے، اسے آن کی آن میں یوں ہڑپ کر لیا، جیسے وہ کئی دنوں کا بھوکا ہو؛ آخری نوالہ لیتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا: ''بہت مزے کی ہے، چکھی ہے تم نے۔'' اور پھر اس نے تانبے کی تھالی کو اس پوٹلی کی طرف اچھال دیا تھا، جس میں یہاں رکھی دوسری چیزیں وہ اور اس کے ساتھی باندھ رہے تھے تا کہ انھیں ساتھ لے جا سکیں۔

اگر میں، چھ سال پہلے کی اس رات چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو وہ رات بھی آسانی سے کاٹی جا سکتی تھی کہ مجھے تنہائی سے کبھی خوف نہیں آیا تھا سوائے اس نہتی تنہائی کے، جو میں نے ناظم خان کی آنکھوں میں اس وقت دیکھی تھی، جب وہ میرے گھٹنوں تلے دبا، مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

لیکن اس روز، جب سپاہی میرے کمرے کو اتھل پتھل کر کے چل دیے، تو مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر دروازہ بھیڑ سکوں، جہاں سے سرد ہوا کی لہروں نے دھاوا بولنا شروع کر دیا تھا۔

کاغانی بھیڑوں کی اون سے بنا کمبل اگرچہ خاصا گرم تھا لیکن اس کے باوجود سردی، سرِ شام ہی آہستہ آہستہ میری ہڈیوں میں سرایت کرنا شروع ہو گئی تھی، جس کا صحیح احساس مجھے اس وقت ہوا تھا، جب ریڑھ کی ہڈی میں مجھے ٹھنڈ کی ایک شدید لہر محسوس ہوئی تھی؛ جوں جوں ٹھنڈ میں اضافہ ہو رہا تھا بخار کی شدت بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے بابا سے سنا تھا کہ بندہ جس چیز کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتا ہے وہ اس پر اتنی ہی حاوی ہوتی جاتی ہے؛ اگر جسم کے کسی حصہ میں درد ہو رہا ہو تو اس سے دھیان ہٹا کر ادھر ادھر کی باتوں میں لگا دینے سے درد کم ہو جاتا ہے، سو میں نے سردی اور بخار سے دھیان ہٹانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ شروع میں، میں نے اپنے ذہن میں حاجرہ بی بی کے نقوش ابھارنے کی کوشش کی، خاص کر وہ لمحہ جب میں نے پہلی بار اس کے سینے کے ابھاروں کی طرف دیکھا تھا لیکن بجائے اس کے کہ اس کے خدوخال میرے ذہن میں ابھرتے، میرے تصور میں وہ لمحہ ابھرا، جب اس نے بستی کی دوسری خواتین کے ساتھ اپنے سینے میں خود چھرا گھونپا تھا، حالاں کہ اس وقت میں مفرور ہو چکا تھا۔

میں نے اس کے تصور کو جھٹک کر دادا کے بارے میں سوچنا چاہا کہ انھی کے مزار کے احاطے میں لیٹا ہوا تھا لیکن چوں کہ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اس لیے ان کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت مشکل پیش آئی؛ ان کے خدوخال کا تصور کرنے کی کوشش میں، میرے ذہن میں بابا کا چہرہ ابھرا لیکن میں نے فوراً اسے بھی جھٹک دیا کہ ان کی تکلیف دہ موت کے تصور نے مجھے مزید درد میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے مکتب کے دنوں کو یاد کرنے کی کوشش کی خاص کر مولوی عنایت اللہ کو جو ہمیں منطق اور تاریخ پڑھاتے تھے اور میرے پسندیدہ لوگوں میں سے تھے لیکن ان کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی، میں اپنا دھیان بخار سے نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

میں پرکاش یوگی کا بتایا ہوا آزمودہ نسخہ ''سانس پر دھیان دو'' آزمانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک میرا دھیان سہ پہر کے اس لمحے کی طرف گیا جب سپاہیوں نے میرے دروازے کو دھکا

دیا تھا اور میں نے جلدی میں منہ پر سے کمبل سرکا دیا تھا تا کہ مجھے شناخت کرنے میں انھیں آسانی ہو۔
میں نے یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ اگر کمبل سرکانے میں لحہ بھر کی بھی دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؛ ایسا سوچتے ہوئے میں نے خود کو دوبارہ اسی لمحے میں محسوس کیا، احساس کی شدت اتنی تیز تھی کہ مجھے لگا کہ انھوں نے ابھی ابھی ایک زوردار دھکے سے دروازہ کھولا ہے اور میری رانوں میں دبا نوشتہ ضبط کر لیا ہے۔ مارے خوف کے میں نے آنکھیں کھولیں تو کمبل واقعی میرے منہ سے سرکا ہوا تھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے کمرے میں ایک ہیولا سا حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔

''میں ہوں۔'' مجھے ایک شناسا آواز سنائی دی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''مجھے معلوم تھا وہ کنجر سب کچھ اٹھا کر لے گئے ہوں گے، اس لیے میں سیدھا اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ وہاں سے مشکیزہ بھی ساتھ لایا ہوں اور اپنی بہن سے کھچڑی بنوا کر بھی۔ اٹھیں پہلے یہ کھائیں؛ میں کنویں سے پانی بھر کر لاتا ہوں اور آپ کے لیے پودینے اور خشخاص کا قہوہ بناتا ہوں۔''
جس سمے عبدل قہوہ بنانے کے لیے چولھے میں لکڑیاں جھونک رہا تھا مجھے لواخ روشن کرنے خیال سوجھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرا بخار ٹوٹنے لگا تھا اور سردی کی شدت بھی کم ہونے لگی تھی۔

چار

بابا کے اُس نوشتے کو، جسے میں تینتیس سال تک سینے سے لگائے پھر تا رہا ہوں، میں نے اتنی بار پڑھا تھا کہ اس کا حرف حرف میری یاد داشت میں آج بھی اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ اب بھی، جب کہ مجھے اسے آخری بار دیکھے، پورے چھے سال ہو چکے ہیں، میں اسے دو بارہ اسی ترتیب سے، انھی لفظوں میں اس طرح لکھ سکتا ہوں، جیسے کوئی حافظ قرآن ؛ اگر وہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو، قرآن کو بغیر دیکھے حرف بہ حرف پورے رموز و اوقاف اور اعراب کے ساتھ، صفحہ قرطاس پر یوں منتقل کر سکتا ہے جیسے صدیوں سے خطاط اسے حرف بہ حرف نقل کرتے آئے ہیں اور پوری دنیا میں اس وقت قرآن پاک کے جتنے بھی نسخے ہیں، ان میں کسی زبر، زیر یا پیش کا بھی فرق نہیں ؛ ان میں وہ قرآن بھی شامل ہیں جو، اب انگریزوں کی طرف سے قائم کیے گئے لاہور، دلی اور کلکتہ کے چھاپہ خانوں سے شایع ہو رہے ہیں۔

مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ اس نوشتے کا کون سا صفحہ کس لفظ پر ختم ہوتا تھا اور کون سا صفحہ کس لفظ سے شروع ؛ لیکن اُس کی کوئی بھی نقل چاہے میں نے خود اپنے ہاتھوں ہی سے کیوں نہ تیار کی ہو، اُس اصلی نوشتے کا کبھی نعم البدل نہیں ہو سکتی، جسے بابا نے حسن علی خان کی فرمائش پر، انھی کی طرف سے بھیجے گئے انگریزی طرز کے مرصع قلم سے لکھا تھا۔

بڑی تقطیع کے ۲۱۲ صفحات پر مشتمل اُس نوشتے کی لکھائی زیادہ خوبصورت نہیں تھی کہ میرے بابا خوش خط نہیں تھے، لیکن اس کی چرمی جلد کے سرنامے کی خطاطی عمر گل صاحب نے کی تھی جو اپنے وقت کے مشہور خطاط تھے اور ان کی خطاطی کے چرچے، ان دنوں چار دانگ عالم میں تھے۔ اُن کے شاگرد لاہور اور

دلی تک پھیلے ہوئے تھے اور کئی راجوں، مہاراجوں اور نوابوں نے انھیں اپنے دربار سے وابستہ ہونے کی پیش کش کی تھی لیکن انھوں نے مانگل چھوڑنا گوارا نہ کیا، جہاں ان کے مرشد شہزادہ گل محمد عرف میاں کنگال نے اپنا آخری وقت گزارا تھا اور یہیں آسودہء خاک ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب میاں کنگال نے اپنے مرشد و مربی مرزا مظہر علی جانِ جاناں کو، جن کی صحبت سے متاثر ہو کر انھوں نے شاہی چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی اور دلی جیسے دور دراز علاقے سے سفر کر کے مانگل تشریف لائے تھے، عمر گل سے خط لکھوایا تو ان کی خوش نویسی دیکھ کر جانِ جانان نے جوابی خط میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اسی خطاط سے اپنے دیوان کی خطاطی کرانا چاہتا ہوں۔

عمر گل صاحب، جو اُن دنوں جوان تھے، اپنے مرشد کے حکم پر، اُن کے مرشد کے حکم کی تعمیل میں دلی کا سفر اختیار کرنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ برف باری شروع ہو گئی اور مانگل سے دلی جانے والے تمام راستے بند ہو گئے، جس کی وجہ سے انھیں یہ سفر کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرنا پڑا تھا۔ ابھی وہ برف پگھلنے اور راستے کھلنے کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ پندرہ محرم کو خبر آئی کہ سات محرم کو کچھ لوگ ان کی زیارت کرنے کے بہانے، ان کے گھر میں داخل ہوئے اور انھیں طمنچے سے گولی ماردی، جس کے زخموں کی تاب نہ لا کر، تین دن بعد دس محرم کو واصل بحق ہو گئے۔

میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب یہ خبر میاں کنگال تک پہنچی تو انھوں نے فوراً نوبچی کو بلوایا اور اسے نوبت بجانے کا کہا۔ نوبچی نے انھیں بتایا کہ آپ ہی کا حکم تھا کہ محرم کے پورے مہینے میں نوبت نہ بجائی جائے تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر اُس وقت میرے کہے کو پذیرائی بخشی تھی تو اب بھی یہ میرا ہی حکم ہے۔ جوں ہی نوبچی نے نوبت پر ڈنڈے سے ضرب لگائی، ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور انھوں نے ایسی دھمال ڈالی کہ اس سے پہلے انھیں اس حال میں کسی نے نہیں دیکھا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک وہ بے ہوش ہو کر گر نہیں پڑے۔ مرید انھیں اٹھا کر حجرے میں لے گئے؛ اس دن کے بعد، اپنی وفات تک، جو اس واقعے کے تین سال بعد محرم ہی کے مہینے میں ہوئی، انھیں کسی نے حجرے سے باہر نہیں دیکھا تھا۔

لواخ

عمر گل صاحب کو میں نے زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ اسی دن دیکھا تھا، جب میں بابا کا نوشتہ لینے مانگل میں واقع ان کے گھر گیا تھا، جس کی جلد بندی بابا نے، مانگل ہی کے ایک جلد ساز سے کرائی تھی، جس کا آبائی پیشہ تو جفت سازی تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ایسی صفائی تھی کہ لوگ اسی سے کتابوں کی جلد بندی کرایا کرتے تھے۔

چمڑے کا وہ ٹکڑا، جو نوشتے کی جلد پر منڈھا ہوا تھا اور جس پر سر نامہ کندہ تھا، بابا گھر سے ساتھ لے کر گئے تھے۔ جلد ساز نے اس کی مناسب کتر بیونت کر کے اسے نوشتے کی جلد پر یوں منڈھ دیا تھا جس طرح وہ کسی دور میں، بابا کے محبوب گھوڑے کے جسم پر منڈھا ہوا تھا۔

جلد بندی کے بعد وہ اسے لے کر عمر گل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تا کہ ان سے سر نامہ لکھوا کر اُس کی اہمیت کو دو چند کر سکیں۔ وہ اُن دنوں خاصے ضعیف ہو چکے تھے اور ان کی بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ انھیں خطاطی کو خیر آباد کہے ہوئے بھی ایک عرصہ ہو چکا تھا لیکن جب بابا نے اپنا تعارف کرایا اور انھیں بتایا کہ یہ حسن علی خان کی خواہش ہے تو انھوں نے سر نامہ لکھنے کی فوراً ہامی بھر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ یہ کام ابھی اور اسی وقت ممکن نہیں؛ سر دست نہ تو قلم دستیاب ہے اور نہ ہی روشنائی۔ یہ چیزیں بازار سے منگوائی جا سکتی ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ حسن علی خان کی فرمائش پر لکھے گئے اس نوشتے کے سر نامے کے لیے، میں اپنے کسی شاگرد سے خصوصی روشنائی تیار کراؤں؛ آپ دس دن بعد آجائیں یا پھر کسی کو بھیج دیں۔

میں ان دنوں بہ سلسلہء تعلیم مانگل ہی میں مقیم تھا؛ بابا واپس جانے سے پہلے میرے مکتب تشریف لائے تھے اور انھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ دس دن بعد عمر گل صاحب کے ہاں سے نوشتہ لے کر اپنے پاس رکھ لوں اور اگلے ماہ جب چھٹیوں پر گھر آؤں تو ساتھ لیتا آؤں۔ عمر گل صاحب کسی دور میں ہمارے مکتب میں خطاطی کے استاد رہے تھے اور ان دنوں خطاطی کا مضمون منتخب کرنے والوں کی تعداد طب کے طلبہ سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی اور اس کی وجہ صرف اور صرف عمر گل تھے۔

میں، بابا کے بتائے ہوئے دن، اپنے ایک ہم مکتب کے ساتھ، جو وہیں کا رہنے والا تھا اور

وہاں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے بخوبی واقف تھا، اس محلے پہنچا جو سڑک سے متصل میاں کنگال کے مزار سے شروع ہوتا تھا اور کوچہ ٔ کنگالاں کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں قدم رکھتے ہی اس نے بتایا تھا کہ بتائے گئے پتے کے مطابق، ان کا مکان اسی گلی میں کسی جگہ ہونا چاہیے۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا اور مزار کے احاطے میں کھڑے ایک شخص سے، جس کے چہرے پر برص کے داغ تھے اور جو ہمیں پہلے ہی سے دیکھ رہا تھا، ان کے مکان کا پتہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسی گلی کے آخری نکڑ سے تھوڑا پہلے، ایک مکان آئے گا جس کے باہر لگی تختی پر، تلوار بنی ہوئی ہے، وہی ان کا گھر ہے۔ جب ہمیں گلی کی نکڑ نظر آنا شروع ہوئی تو ہم نے گھروں کے دروازوں کو بغور دیکھنا شروع کر دیا۔ کسی بھی مکان پر تختی نہیں تھی۔ اچانک دور سے ایک دروازے پر تختی نظر آئی۔ جب ہم قریب پہنچے اور غور سے دیکھا تو وہ تلوار کی شبیہ نہیں تھی بلکہ ان کے نام کا پہلا حصہ 'عمر' دیوار کی تختی پر اس طرح کندہ کیا گیا تھا کہ ناخواندہ لوگوں کو تلوار کی شبیہ لگتا تھا۔

مکان بہت شاہانہ نہیں تھا لیکن دوسرے مکانوں سے اتنا مختلف ضرور تھا کہ دیکھنے والا اس کی انفرادیت کو، جس میں ایک خاص طرح کی نفاست سی جھلکتی تھی، محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دستک کی آواز سن کر ایک نوجوان نے، جو مجھ سے عمر میں چند سال بڑا ہوگا، دروازہ کھولا اور ہم سے آنے کا مدعا پوچھا۔ میرا جواب سن کر وہ اندر چلا گیا اور کافی دیر کے بعد پلٹا اور ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ہماری نظر سامنے منقش پایوں والے پلنگ پر بیٹھے ایک بزرگ پر پڑی، جو دیوار کے ساتھ اوپر نیچے رکھے گئے تکیوں پر نیم دراز تھے۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس سے پہلے کسی اور کمرے میں تھے اور ہمیں اندر بلانے سے پہلے، انھیں اس کمرے میں خصوصی طور پر لایا گیا تا کہ ہم ان سے ملاقات کر سکیں۔ ان کا چہرہ اور ہاتھ جھریوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کی بھوئیں تک سفید ہو چکی تھیں، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی عمر، میرے نانا کی طرح، اسی سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ دعا، سلام اور احوال پرسی کے بعد دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی اور اس دوران میں وہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے، کافی دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ ہم بھی مئودب بیٹھے رہے۔

''اب وہی فاتح ہوگا جو صاحبِ سیف وقلم ہوگا۔'' انھوں نے تکیے کا سہارا لے کر ہلکی سی کروٹ

لیتے ہوئے کہا۔

''سکھ انگریزوں سے اس لیے مار کھا گئے ہیں کہ ان کے پاس صرف تلوار تھی اور انگریزوں کے پاس تلوار بھی ہے اور قلم بھی۔ جب تمھارے باپ نے مجھے بتایا کہ تم یہاں پڑھ رہے ہو تو مجھے بہت خوشی ہوئی؛ جنگجوؤں کے ہاتھ اگر علم کا ہتھیار بھی آجائے تو انھیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ تم ایک بہادر قبیلے کے بیٹے ہو، جس پر تمھیں فخر ہونا چاہیے لیکن ایک بات یاد رکھنا اب جنگ صرف بہادری سے نہیں لڑی جا سکتی؛ اس کے لیے ذہانت کی بھی ضرورت ہے اور ذہانت علم ہی سے آتی ہے۔ اب جیتیں گے وہی جو بہادر بھی ہوں گے اور ذہین بھی؛ تم میں دونوں چیز جمع ہو رہی ہیں۔ اچھی بات ہے۔''

جب وہ گفتگو کر رہے تھے، میری نظر ان کے دائیں ہاتھ کی حرکت پر جمی ہوئی تھی، جس کے انگوٹھے اور اس کے ساتھ کی دو انگلیوں میں ایک خاص طرح کا ٹیڑھا پن تھا۔ بات کرتے ہوئے جب وہ ہاتھ کو حرکت دیتے تو ان کا انگوٹھا اور شہادت کی انگلی، اپنی ساتھی انگلی کے ساتھ یوں ملی ہوئی لگتیں جیسے انھوں نے، ان میں کوئی قلم پکڑا ہوا ہو اور انھیں خدشہ ہو کہ اگر انھوں نے انگلیوں کو انگوٹھے سے جدا کر دیا تو قلم نیچے گر جائے گا۔

وہ کافی دیر تک مجھ سے مخاطب رہے جس میں زیادہ تر موضوع میرا قبیلہ اور اس کی طرف سے پچھلے تیس پینتیس برسوں میں لڑی گئی جنگیں ہی رہیں؛ لیکن انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ مسلمان بالاکوٹ والی جنگ نہیں جیت سکے ورنہ اس وقت اس علاقے کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور انگریزوں کو بھی، اس علاقے میں قدم جمانے کا موقع نہ ملتا۔

پھر انھوں نے مجھ سے میرے پسندیدہ مضمون کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے انھیں تاریخ اور منطق کا بتایا تو ہنستے ہوئے کہنے لگے: ''ایک جنگجو کے بیٹے کی تاریخ میں دلچسپی تو سمجھ میں آتی ہے کہ ساری انسانی تاریخ جنگوں سے عبارت ہے، لیکن منطق کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے: یہ تمھارے نام کا اثر لگتا ہے، ایک سکندر تم ہو جو یہاں مانگل میں منطق پڑھ رہے ہو اور ایک سکندر وہ تھا، جس نے یونان میں ارسطو سے منطق پڑھی تھی۔ مجھے بھی منطق اور تاریخ

دونوں میں دلچسپی رہی ہے لیکن تاریخ ہمیشہ مجھے غیر منطقی ہی لگی ہے؛ انتہائی غیر منطقی۔ اس بات کی سمجھ تمھیں ابھی نہیں آئے گی۔ اگر چہ بزرگوں نے کہہ رکھا ہے کہ بزرگی بہ عقل است نہ بسال، لیکن عقل بھی تو اتنی جلدی نہیں آتی، ان باتوں کو سمجھنے کے لیے تمھیں عقل کی پختگی درکار ہے، جو آتے آتے آئے گی۔

سچی بات یہ ہے کہ ان کی بیشتر باتیں اس وقت میری سمجھ سے واقعی بالاتر تھیں لیکن چوں کہ وہ ایک ایسے شخص تھے، جن سے بابا کو عقیدت سی تھی اور وہ اپنے نوشتے کا سر نامہ لکھوانے، اتنی دور سے خاص طور پر یہاں آئے تھے، اس لیے مجھے ان سے ایک انس سا ہوگیا تھا اور میں ان کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا، جس کی وجہ سے یہ آج بھی میرے ذہن میں نقش ہیں۔

وہ تھوڑی دیر خاموشی سے کچھ سوچتے رہے، پھر انھوں نے کسی کو آواز دی۔ کمرے کے اندر موجود ایک اور کمرے کا دروازہ کھلا جہاں سے وہی نوجوان، جو ہمیں ان کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا، دوبارہ نمودار ہوا۔ انھوں نے اسے کہا کہ سامنے الماری میں بڑی تقطیع کی چرمی جلد والی ایک کتاب رکھی ہے، وہ لے آؤ۔ اس نے الماری کھولی تو میں نے دیکھا کہ وہ کتابوں سے بھری پڑی ہے، انھوں نے ایک کتاب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا؛ اس نے وہ کتاب نکال کر، ان کے حوالے کی۔ انھوں نے اس کی جلد پر ہاتھ پھیرا، جیسے اس پر کندہ لفظوں کو چھو کر محسوس کر رہے ہوں۔ اس لمحے میں نے ان کے چہرے پر نظر دوڑائی تو اس پر اطمینان کی ایک خاص لہر سی تیر رہی تھی اور ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جس میں جلال سے زیادہ جمال تھا۔

''بابا کو بتانا۔ میں نے اسے پڑھ بھی لیا ہے۔'' انھوں نے نوشتہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''اسے پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، ایک بہادر قبیلے کے فرد نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہیں، جو آئندہ نسلوں کے کام آئیں گی۔''

جب میں نے ان سے اجازت چاہی تو وہ میرا ہاتھ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں پکڑ کر، گرم جوشی سے دیر تک ہلاتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ اب بھی خاصے مضبوط ہیں، خاص کر دایاں ہاتھ جس کی انگلیاں ٹیڑھی تھیں۔

لواخ

اس واقعے کے برسوں بعد بھی، جب تک یہ نوشتہ میرے پاس رہا، میں جب بھی اس کے سرنامے پر ہاتھ پھیرتا، مجھے عمر گل مرحوم کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوتا تھا، بالکل ایسے ہی جیسے میری انگلیاں جب ان لفظوں سے ہٹ کر، اس کی چرمی جلد کو چھوتیں تو مجھے بابا کا وہ گھوڑا بہت شدت سے یاد آتا، جس کا چمڑا اس نوشتے پر منڈھا ہوا تھا۔ اس گھوڑے کا نام لالی تھا؛ یہی وہ گھوڑا تھا، جس پر بیٹھ کر بابا نے حسن علی خان کی سرکردگی میں سکھوں کے خلاف وہ آخری جنگ لڑی تھی، جس میں سکھوں کو مقامی راجہ کی مکمل اور غیر مشروط حمایت حاصل تھی، وہی راجہ جس کے آبا و اجداد نے سکھوں کی آمد سے پہلے ہماری ریاست پر بے شمار حملے کیے تھے لیکن ہر بار انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ بڑا صبر آزما معرکہ تھا، ہمارا روایتی دشمن ان کے ساتھ مل گیا تھا اور دونوں نے ایک ساتھ ہماری ریاست پر حملہ کیا تھا۔

مقامی راجہ، جس نے حملے کے دوسرے ہی دن پسپائی اختیار کر لی تھی، کوہِ ہالہ کے قریب درکوٹ کے درے میں، جہاں اس کا پیش رو ہمارے ہی قبیلے کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اپنی پوری فوج کے ساتھ نیست و نابود ہو گیا تھا اور سکھوں نے تین دن بعد، دو سو سے زائد جانیں گنوا کر، راہ فرار اختیار کی تھی۔ بابا نے اپنے دستے کے ساتھ، اسی گھوڑے پر بگڑہ تک ان کا تعاقب کیا تھا، جس کا ذکر انھوں نے نوشتے میں تفصیل کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد اس علاقے پر نہ تو سکھوں نے کوئی حملہ کیا اور نہ ہی راجاؤں کو اس کی جرات ہوئی۔

اس جنگ کے چھ سال بعد، جن دنوں میجر ایبٹ نے مقامی لوگوں کی مدد سے، جو سکھوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے، یہ سارا علاقہ ہتھیا کر انگریز سرکار کے حوالے کر دیا تھا، یہ گھوڑا جنگل میں گھاس چرتے ہوئے ایک بڑی چٹان سے پھسل کر زخمی ہو گیا تھا؛ کافی عرصے تک اس کا علاج چلتا رہا وقتی طور پر وہ ٹھیک بھی ہو گیا لیکن اس کی چال میں لنگ آ گیا تھا اور وہ سواری کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہمارے ہاں اب بھی کوئی گھوڑا، گدھا، خچر یا ٹٹو؛ اگر سواری یا بار برداری کے قابل نہ رہے تو اسے مار دیا جاتا ہے یا پھر اسے جنگل میں چھوڑ دیا جاتا ہے، جہاں یا تو اسے جنگلی درندے ہڑپ کر جاتے ہیں یا پھر سردی یا بھوک کی وجہ سے خود ہی مر جاتا ہے؛ انھیں اصطبل میں باندھ کر کھلانا کارِ فضول سمجھا جاتا

ہے۔ بابا کو بھی لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ یا تو اسے ذبح کر کے دفنا دیا جائے یا پھر سسک سسک کر مرنے کے لیے جنگل میں چھوڑ دیا جائے لیکن انھوں نے کہا تھا کہ اس نے میری بہت خدمت کی ہے، جب تک یہ طبعی موت نہیں مرتا اب اس کی خدمت میں خود کروں گا۔ اس کے بعد بھی وہ سال سوا سال تک زندہ رہا۔ جب وہ مرا تو انھوں نے اس کی کھال اتروا کر محفوظ کر لی تھی۔ کھال اترواتے ہوئے ان کے ذہن میں کیا تھا، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اسے عام روایت کے مطابق بستی کے جنگجوؤں میں نہیں بانٹا تھا؛ تاہم مجھے یقین ہے کہ اس کا وہ مصرف، جو نوشتے کے وجود میں آنے کے بعد ،ان کے ذہن میں آیا تھا، اُس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوا ہوگا۔

بابا کو یہ گھوڑا اس لیے بھی بہت عزیز تھا کہ اس پر سوار ہو کر، لڑی جانے والی جنگِ ناڑہ کی تاریخی فتح کے باعث، انھیں تقریباً اکیس برسوں کی مسلسل جنگ و جدل کے بعد پہلی مرتبہ فراغت میسر آئی تھی۔ فراغت کے انھی دنوں میں، انھوں نے اس پناہ گاہ کو گرا کر، جسے سکھوں کے اس علاقے پر حملے کے وقت حفاظتی نقطہ نظر سے تعمیر کیا گیا تھا، ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی تھی، جس کا سارا فرش کنجور کے پتھروں کا تھا۔ بعد ازاں یہیں بیٹھ کر حسن علی خان نے انگریزوں کے خلاف اس بغاوت کا منصوبہ بنایا تھا، جسے کھلنے کے کچھ ہی دن بعد بابا کو اُن کے اکیس ساتھیوں سمیت توپوں سے اڑا دیا گیا تھا۔

عربی نسل کا یہ گھوڑا، جس کا چمڑا بعد ازاں نوشتے کی جلد بندی میں کام آیا، انھیں حسن علی خان نے تحفے میں دیا تھا۔ یہ گھوڑا تقریباً میرا ہم عمر تھا۔ جب ہم نے پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں کی عمر تقریباً چار ساڑھے چار سال تھی لیکن میں اس وقت بچہ تھا اور وہ بھرپور جوان۔

میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں، میری یادداشت میں وہ لمحہ عود کر آتا ہے جب یہ ہماری بستی میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے صحن میں کھیل رہا تھا کہ مجھے دور سے بابا آتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ وہ اسی گھوڑے پر سوار تھے، جسے بعد میں لالی کا نام دیا گیا اور گلا نام کا وہ گھوڑا، جس پر بیٹھ کر وہ یہاں سے حسن علی خان کے گاؤں منال گئے تھے، خراماں خراماں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا؛ جو بوڑھا ہونے کی وجہ سے اب ان کے کام کا نہیں رہا تھا اور اسے اس دن کے چند ہی

ماہ بعد جنگل میں لے جا کر مار دیا گیا تھا، جس کی کھال اسی شام موچی اتار کر اپنے گھر لے گیا تھا، جو کچھ ہی ماہ بعد جوتوں کی شکل میں بستی کے جنگجوؤں میں بٹ گئی تھی۔ ہمارے ہاں جس گھوڑے نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو اس کی کھال اتار لی جاتی ہے اور اس کی کھال کا جوتا پہننا صرف اور صرف اس شخص کا حق ہوتا ہے، جو جنگجو ہو۔ عام سواری اور بار برداری کے گھوڑوں اور خچروں کو، جب وہ سواری یا بار برداری کے قابل نہ رہیں، مار کر کھال سمیت دفن کر دیا جاتا ہے۔

❁

''اماں بابا کے پاس دو دو گھوڑے ہیں۔'' میں؛ انھیں دیکھتے ہی، ماں کو اطلاع دینے بھاگتا ہوا، باورچی خانے کی جانب گیا تھا، جہاں وہ اس وقت ہانڈی بنا رہی تھیں اور چولھے میں پھونک مارنے کی وجہ سے ان کی چادر اور کپڑوں پر چولھے سے اڑنے والی راکھ کے ذرے بکھرے پڑے تھے۔ اماں یہ سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور جب ان کی نظر بابا اور دونوں گھوڑوں پر پڑی تو انھوں نے فوراً کپڑے جھاڑے تھے اور جلتی لکڑیوں کو ہانڈی والے چولھے سے نکال کر دوسرے چولھے میں جھونکا تاکہ ہانڈی جل نہ جائے اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر کے ساتھ بنے اصطبل میں آ گئی تھیں۔ میں جو، ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا آیا تھا؛ کبھی بابا کی طرف دیکھتا اور کبھی اماں کے چہرے کی طرف، جہاں حیرت بھری خوشی تھی۔ بابا اب اس میدان میں داخل ہو چکے تھے، جو ہمارے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا اور جہاں بستی کے نوجوان ہر روز شام کے وقت ڈھول کی تھاپ پر گتکا کھیلا کرتے تھے اور میں انھیں محوِ رقص دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اتنے میں بڑی ماں، جو کسی دوسرے کمرے میں تھیں، اصطبل پہنچ گئیں اور انھوں نے آتے ہی گھوڑے کی لگام تھامی اور بابا سے پوچھا: ''کہاں سے لائے ہیں؟''

''حسن علی خاں صاحب نے تحفہ دیا ہے۔'' انھوں نے بچوں کی طرح چہکتے ہوئے کہا۔

''سچ۔'' بڑی ماں کو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''تو کیا اب میں تم سے جھوٹ بولوں گا۔'' بابا نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے مصنوعی غصے سے کہا۔

''میں بھی اس پر بیٹھوں گا۔'' انھوں نے اترنے کے لیے ایک پاؤں رکاب سے نکالا ہی تھا کہ

میں اپنے دل کی خواہش زبان پر لے آیا تھا۔

انھوں نے بڑی ماں کو، جو چھوٹی ماں کے برعکس، مضبوط کاٹھی اور مضبوط اعصاب کی مالک تھیں، اشارہ کیا کہ اسے یہاں گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھاؤ۔ بڑی ماں نے مجھے اٹھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر یوں اچھال دیا، جیسے انھیں یقین ہو کہ محض چار ساڑھے چار سال کا بچہ، جس نے عربی نسل کا یہ گھوڑا پہلی مرتبہ دیکھا، خود کو اس کی پیٹھ پر، ایک تجربہ کار گھڑسوار کی طرح سنبھال لے گا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ہوا میں بلند ہوتے ہی، چھوٹی ماں کی چیخ سی نکل گئی تھی؛ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بابا نے مجھے ہوا میں یوں جھپٹ لیا جیسے باز، درخت کی شاخ سے گرتے ہوئے اپنے بچے کو تو ان کے سانس میں سانس آیا تھا۔

''آرام سے۔'' بابا نے مجھے سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

میں جو تھوڑی دیر پہلے گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے مچل رہا تھا، اس پر بیٹھتے ہی سہم سا گیا تھا۔ بابا نے گھوڑے کو میدان کی طرف موڑا اور ہلکی ایڑ لگائی۔ میں کچھ دیر تو سہا ہوا، ان کے بازوؤں سے چمٹا رہا لیکن جب میدان کے دوسرے کونے میں انھوں نے گھوڑے کو واپس موڑنے کے لیے روکا تو میری یہ سہاہٹ بہادری اور سرشاری میں بدل گئی اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ واپسی پر جب گھوڑے کی رفتار تیز ہوئی تو مجھے درخت اور پتھر پیچھے کی طرف بھاگتے دکھائی دیے، جو میرے لیے ایک عجیب و غریب بات تھی۔ میں نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''بابا وہ دیکھو پتھر بھاگ رہے ہیں اور درخت بھی۔''

''وہ ہمارے گھوڑے کے ڈر سے بھاگ رہے ہیں۔'' انھوں نے گھوڑے کو مزید ایڑ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ جب گھوڑا واپس آ کر رکا اور بابا نیچے اتر کر، مجھے اتارنے لگے تو بڑی ماں نے خود آگے بڑھ کر مجھے گھوڑے سے اتارا۔ اس لمحے میری دونوں ماؤں کے چہرے پر ایک ایسی فتح مندی تھی، جیسی میں نے بعد میں صرف اس وقت دیکھی جب بابا اسی گھوڑے پر، اُس جنگ سے پلٹے تھے، جس میں ہمارے قبیلے نے ایک ہی معرکے میں اپنے دو دشمنوں کو بدترین شکست سے دوچار کیا تھا اور اس فتح کی خبر بابا اور ان کے ساتھیوں کے واپس پلٹنے سے پہلے ہی پوری بستی میں پھیل چکی تھی اور ان کا استقبال بستی والوں نے ڈھول کی تال پر گنکا کھیل کر کیا تھا۔

لواخ

یہ سکھوں اور مقامی راجاؤں کے خلاف ہمارے قبیلے کی آخری اور میری یاد میں لڑی جانے والی پہلی جنگ تھی، جو حسن علی خان کے بابا کو تحفے میں دیے جانے والے اس گھوڑے کی، جس کے چمڑے کا ایک ٹکڑا، اس نوشتے کی جلد پر منڈھا ہوا تھا، ہمارے گھر آمد کے سال بھر بعد لڑی گئی تھی۔

جس طرح اُس نوشتے کے جلد ساز کا آبائی پیشہ جفت سازی تھا اور کبھی کبھی جب اسے جوتوں سے فرصت ملتی تو کتابوں کی جلد بندی بھی کر لیا کرتا تھا، بالکل اسی طرح ہمارا پیشہء آبا تو سپاہ گری ہی تھا لیکن جب جنگوں میں وقفے آتے تو ہم کھیتی باڑی اور باغبانی میں جُت جاتے تھے تاکہ اگلی جنگ سے پہلے پہلے، جو کسی بھی وقت اور کہیں بھی شروع ہو سکتی تھی، گندم، جو، مکئی، باجرہ، دالیں وغیرہ اور خشک میوا جات؛ خوبانی، اخروٹ، املوک، انار دانہ، مونگ پھلی، انجیرِ سیاہ، شہتوت وغیرہ وافر مقدار میں جمع کیے جا سکیں۔

اس نوشتے کا ابتدائیہ، ایک مکتوب کی صورت میں تھا، جس کا مخاطب میں، یعنی ان کا بزدل اور نالائق بیٹا، سکندر خان تھا۔ یہ ابتدائیہ، جس میں بابا نے اسے تحریر کرنے کی غرض و غایت بیان کی تھی، آج بھی مجھے اسی طرح حرف بہ حرف یاد ہے؛ جیسے سورہء یٰسین، جسے بڑی ماں نے، مانگل کے مدرسے میں میرے داخلے سے کہیں پہلے، مجھے زبانی یاد کرایا تھا اور میں آج بھی اسے حرف بہ حرف سنا سکتا ہوں، اسی لحن میں، جس میں انھوں نے مجھے یاد کرائی تھی۔

پانچ

نوشتے کا ابتدائیہ یوں تھا۔

''سکندر، میرے بیٹے!

مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ تم نے وہاں بہت کچھ پڑھا ہوگا؛ قرآن، حدیث، تفسیر، صرف ونحو، فقہ، تاریخ، منطق، فلسفہ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں تو ایک نیم خواندہ سا آدمی ہوں۔ پڑھنے کا مجھے بھی شوق تھا لیکن مجھے تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی کہ سکھوں نے میدان ہزارہ پر قبضہ کر کے وہاں قلعہ تعمیر کر لیا تھا اور اب وہ ہماری ریاست پر پہلے حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہاں زمانے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے؛ اتنا کچھ کہ تمھیں میرے جتنا عالم بننے کے لیے کم سے کم اتنی ہی جنگیں لڑنا پڑیں گی جتنی میں نے قبیلے والوں کے ساتھ مل کر لڑی ہیں۔

بیٹے! میں خوش قسمت تھا کہ مجھ سے لڑنے والے اور اس کی منصوبہ بندی کرنے والے مجھ جیسے ہی تھے اور میں اُن کی اُن تمام جنگی چالوں سے واقف تھا، جو وہ چل سکتے تھے لیکن تمھیں ایک ذہین اور چالاک دشمن کا سامنا ہے، جس کا دورانِ جنگ، بازوؤں سے زیادہ دماغ چلتا ہے۔

تم نے تاریخ کتابوں میں پڑھی ہے اور میں نے میدان جنگ میں۔ میں نے ہوش سنبھالا تو میرا باپ اس علاقے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ راجاؤں کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ میں جوان ہوا تو یہاں سکھ اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اب جب تم جوان ہو رہے ہو تو انگریز۔

میں ایک جنگجو ہوں اور میرا باپ بھی جنگجو تھا، جسے میں نے میدان میں دادِ شجاعت دیتے

ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔میرا دادا بھی جنگجو ہی تھا لیکن میرا پردادا اور اس کا باپ ایسا نہیں تھا؛ یہ بات مجھے میرے باپ نے بتائی تھی۔ان کے دور میں ایک طویل عرصے تک، اس علاقے پر کسی بیرونی طاقت کو حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی کہ انھوں نے ایک معرکے میں اپنے دشمن کو ایسی بدترین شکست سے دو چار کیا تھا کہ ہر سو ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔سو وہ ہل جوتتے، فصلیں اگاتے، باغ لگاتے، روزانہ شام کو گتکا کھیلتے اور مزے سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔

انھیں اگر کسی چیز کا خوف تھا تو صرف شیروں، چیتوں اور دوسرے درندوں کا تھا۔اس دور میں بہادری کا تصور انھی جانوروں کے شکار سے وابستہ تھا، سب سے بہادر شخص وہی کہلاتا تھا، جو کسی درندے کا شکار کرے۔وہ اپنے شکار کردہ درندوں کی کھالوں میں بھس بھر کر گھروں میں سجاتے تھے تاکہ دوسروں پر اپنی بہادری کا رعب جما سکیں۔

یہ دھرتی جس پر ہم کھڑے ہیں، اس کی مٹی میں ہمارے بزرگوں کا خون شامل ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آئے؟ کیوں آئے؟ اور یہاں کب آباد ہوئے؟ بس بزرگوں سے سنی ہوئی کچھ روایتیں ہیں، جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہیں؛ یہ کہاں تک صحیح ہیں، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ باتیں؛ جو میں نے اپنے باپ سے، اس نے اپنے باپ سے اور اس نے اپنے باپ سے سنیں، میدان جنگ میں ہمیشہ میرا لہو گرماتی رہی ہیں اور اب بھی؛ جب میں ہاتھ میں تلوار تھام کر، حملہ آور دشمن کے مدِمقابل آتا ہوں تو مجھے اُس پر جھپٹنے میں مدد دیتی ہیں، اس لیے میں چاہتا تھا کہ یہ باتیں لکھ کر تمھارے اور تمھارے ہم عمروں کے لیے محفوظ کرلوں؛ ہوسکتا ہے کسی معرکے میں تم لوگوں کے کام آئیں۔

میں جب میدان میں اترتا ہوں اور دشمن کو للکارتا ہوں تو انھیں یہ ضرور یاد دلاتا ہوں کہ میں خانی زمان خان، سید محمد خان کا بیٹا ہوں، جس نے فلاں جنگ میں کشتوں کے پشتے لگائے تھے اور اس کے باپ نے فلاں معرکے میں دشمن سردار کے چھکے چھڑائے تھے۔میں چاہتا ہوں کہ تم نے جہاں اتنی کتابیں حفظ کی ہیں، وہاں اپنے باپ دادا کی تاریخ بھی حفظ کرلو کہ اب ہمارا نیا دشمن، جو سمندر پار سے آیا ہے، اپنی مرضی سے اس علاقے کی تاریخ لکھوا رہا ہے، جس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اُس

تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا سکے جو یہاں کے لوگوں نے میدان جنگ میں اپنے خون سے لکھی ہے۔ وہ ہمارے مردانِ حر کو چالاک، مکار اور بزدل لکھوا رہا ہے تا کہ ان کی بہادری اور مردانگی اگلی نسلوں میں منتقل نہ ہو سکے اور ان کے دلوں میں فخر کے بجائے احساس کہتری کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے باز رہیں۔

مَیں یہ بات اس لیے پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ انگریزوں نے اس کام کے لیے ایک شخص کو با قاعدہ ملازم رکھ لیا ہے، جس کا نام مہتاب سنگھ ہے؛ وہ اس سے، بزبان فارسی اس علاقے کی تاریخ لکھوا رہے ہیں۔ وہ پچھلے سال مجھ سے ملنے آیا تھا؛ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میجر چیمبر لین نے، جو پورے ہزارے کے بندوبست کا ناظم ہے، مجھے اس کام پر مامور کیا ہے اور وہ اسی سلسلے میں مختلف لوگوں سے مل رہا ہے تا کہ معلومات اکٹھی کی جا سکیں۔

اس نے بتایا تھا کہ اس کی قوم کائستھ ہے اور وطن مرلی پور ہے، جس کا پرگنہ ہوگنی پور، تعلقہ موسیٰ نگر اور ضلع کان پور ہے۔ وہ تلاش روزگار میں لاہور آیا اور کنور کھڑک سنگھ کے ہاں، پانچ سال تک دیوان ٹوڈرمل کی عمل داری میں، دفتر پرگنہ ساہیوال بلوخان میں ملازم رہا۔ اس کے بعد دس مہینے سردار فتح سنگھ حاکم منکیرہ کی خدمت میں گزارے، جہاں سے ہری سنگھ نلوہ کا ملازم ہو کر ۱۸۲۴ میں ہمارے خطے میں وارد ہوا؛ تب سے وہ اسی ملک میں ہے۔

اس نے اس طویل عرصے میں ان تمام جنگوں میں حصہ لیا، جو سکھوں کی طرف سے مقامی قبائل کے خلاف لڑی گئیں۔ وہ سکھوں کی طرف سے ہمارے خلاف بھی برسرِ پیکار رہا تھا، خاص کر جنگ ناڑہ میں۔ اس کے بقول :اس نے ہمارے دو مردانِ جری کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں اس علاقے کے حوالے سے، اُس کی معلومات سے خاصا مرعوب ہوا تھا کہ ایک ایسا شخص، جس کے ملک میں جانے کا، میں تصور بھی نہیں کر سکتا، یہاں آیا، اس نے جنگیں لڑیں اور اس خطے کے تمام مقامات اور ان کے باشندوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتا ہے۔

میں زیادہ حیران اس وقت ہوا جب اس نے مجھے، ہماری ریاست کا ٹھیک ٹھیک حدود اربعہ

بتایا؛ اسے معلوم تھا کہ ہماری ریاست کی مشرقی اور مغربی حدود کہاں تک ہیں اور ان کے شمال اور جنوب میں کون کون سے علاقے ہیں؛ وہ ہماری ریاست کے ان پہاڑی چشموں اور آبشاروں سے بھی واقف تھا، جہاں میں بھی کبھی نہ جاسکا۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کتاب کی تالیف کا مقصد صاحب بہادر کی خوشنودی ہے انھوں نے اس کے تمام اخراجات مجھے پہلے ہی مہیا کر دیے ہیں تاکہ میں فکرِ روزگار سے آزاد ہو کر پورے اطمینان کے ساتھ اس علاقے کی تاریخ لکھ سکوں۔ اس کے پاس کاغذوں کا ایک پلندہ سا تھا، جس میں اس نے مختلف قبائل کی معلومات جمع کی ہوئی تھیں؛ ایک کاغذ پر، جو اس نے مجھے تھمایا تھا، ہمارے قبیلے کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں درج تھیں، جو خلافِ حقیقت تھیں۔

ہمارے قبیلے کے بارے میں اس نے لکھا تھا کہ ہم اور ہمارا ننھیالی قبیلہ کسی ایک ہی شخص کی اولاد سے ہیں۔ جب میں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ درست نہیں تو اس نے بتایا کہ انگریز یہی سمجھتے ہیں۔ مجھے اُس کی، اِس بات پر سخت حیرت ہوئی تھی۔ جب میں نے کہا کہ ان کے ایسا سمجھنے سے حقائق نہیں بدل جاتے تو کہنے لگا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حقیقت وہی ہے جو آپ کہہ رہیں؛ ہوسکتا ہے انگریز ٹھیک کہہ رہے ہوں، جو علم و فضل میں ہم سب سے بہت آگے ہیں؛ اسی علم و فضل کی بدولت، انھوں نے پورا ہندوستان فتح کرلیا اور اب آپ کی ریاست بھی دو ٹکڑوں میں بٹ کر ان کو مالیہ ادا کرنے پر مجبور ہے۔ اُس کے اِس الزامی جواب نے، مجھے وقتی طور پر لاجواب کر دیا تھا۔

انھی کاغذوں میں سے ایک اور کاغذ پر، ایک ایسے واقعے کو توڑ مروڑ کر لکھا گیا تھا، جس کا میں چشم دید گواہ تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں، یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا تھا، تو کہنے لگا آپ ٹھیک کہہ رہے، میں خود بھی اس جنگ میں شریک تھا لیکن میری مجبوری ہے کہ میں پورا سچ نہیں لکھ سکتا ورنہ صاحب بہادر کی خوشنودی حاصل نہیں کر پاؤں گا۔ انھوں نے مجھے ہدایت دی ہے کہ وہ قبائل جنھوں نے سب سے آخر میں ہتھیار ڈالے، ان کے واقعات میں تھوڑا ردو بدل کر دو اور ان لوگوں کے حالات و واقعات کو مبالغے سے بیان کرو جنھوں نے شروع ہی سے ہمارا ساتھ دیا ہے۔

مجھے اس کی یہ باتیں سن کر غصہ تو بہت آیا اور سوچا کہ ابھی اور اسی وقت اس کا سر قلم کر دوں لیکن ہمارے قبیلے کی روایت رہی ہے کہ دشمن بھی اگر مہمان کے طور پر آئے تو اس کی پوری آؤ بھگت کرنا چاہیے۔

اگلے دن میں حسن علی خان سے ملا اور انھیں اس بارے میں بتایا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ مہتاب سنگھ چند دن پہلے میرے پاس بھی اسی سلسلے میں آیا تھا۔ میری خواہش ہے کہ تم اپنے قبیلے کی تاریخ خود لکھو تا کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہو سکے۔

کچھ دن بعد ان کا ملازم خاص میرے ہاں آیا، اس کے ہاتھ میں کورے کاغذوں کا ایک تھدا، خشک روشنائی اور انگریزی طرز کا ایک مرصع قلم تھا۔ جس کی نوک، کانے سے تراشی گئی قلموں کے برعکس، انتہائی نفیس تھی۔ سو میں نے وہ تمام واقعات جو میرے اور میرے باپ دادا کے سامنے رونما ہوئے اس میں لکھ دیے۔

میرے بیٹے!

جب بھی کوئی باشعور آدمی اپنے باپ دادا کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ وہ کون تھے؟ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں اس بارے میں، کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ورنہ میں مہتاب سنگھ کے سامنے لاجواب نہ ہوتا۔

میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہم لوگ یونانی ہیں۔ اس روایت کے مطابق سکندر مختلف ملکوں کو تاراج کرتا ہوا جب اٹک کے اس طرف آیا تو اس نے مارگلہ کی پہاڑیوں کے اردگرد موجود قبائل کو جلد ہی زیر کر لیا اور یہاں کے ایک مقامی راجہ کو تعینات کر کے، راجہ پورس کے مقابلے کو بڑھا، جو ان دنوں پنجاب کا ایک بڑا مردِ حراور اور ہماری ریاست سے کئی گنا بڑی ریاست کا راجہ تھا۔

مقامی راجہ کی مدد کے لیے، اس نے کچھ لوگوں کو یہاں تعینات کر دیا تا کہ وہ اس کی حکمرانی کو برقرار رکھ سکیں اور سرکشی کرنے والوں سے نمٹ سکیں۔ سکندر جب کسی ملک کو فتح کرنے نکلتا تو کچھ فوجیوں کو ان کے خاندانوں سمیت ساتھ لے آتا، تا کہ وہ وہاں آباد ہو کر اس کی حکمرانی کو برقرار رکھ سکیں، ان لوگوں کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

لواخ

سکندر نے راجہ پورس سے ایک صبر آزما جنگ لڑی ۔ پانچ روز تک جاری رہنے والی اس جنگ کے پہلے تین روز راجہ پورس کا پلڑا بھاری رہا تھا۔ چوتھے روز جب سکندر کی فوجوں نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تو راجہ پورس کے وفاداروں نے اسے مشورہ دیا کہ صلح کرلیں یا میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں ورنہ آپ کی موت یقینی ہے ۔راجہ پورس نے خون کے آخری قطرے تک جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے اگلے ہی روز اسے زندہ گرفتار کر کے سکندر کے حضور پیش کیا گیا تو اس نے پورس سے پوچھا بتاؤ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ۔

''وہی سلوک جو بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں ۔''زنجیروں میں جکڑے راجہ پورس نے تمکنت سے کہا۔

سکندر اس غیر متوقع جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے چند شرائط پر وہاں کی حکومت راجہ پورس ہی کے حوالے کر دی اور خود واپسی کی راہ لی ۔اس کے جانے کے بعد اٹک کے اِس طرف اس کی حکمرانی زیادہ دیر قائم نہیں رہی اور وہاں کے مقامی قبائل نے ان فوجیوں سے مقابلہ کیا،ان میں سے بیشتر تو مارے گئے اور کچھ جان بچا کر دریائے ہرو میں اتر گئے اور اس کے کنارے موجود جنگل میں چھپ گئے ۔

مقامی قبائلی جنگجوؤں نے ان کا پیچھا کیا اور انھیں ادھر ادھر تلاش کیا لیکن اتنے بڑے جنگل میں انھیں تلاش کرنا مشکل تھا،سو وہ واپس چلے گئے ۔یہ لوگ کچھ دن وہاں موجود ایک بڑے غار میں چھپے رہے لیکن انھیں ہر وقت پکڑے جانے اور موت کے گھاٹ اتارے جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔مغرب کی طرف اکادکا آبادیاں تھیں اور مشرق کی طرف جنگل بیابان ۔انھوں نے اس بیابان کی طرف آنے کا قصد کیا اور وہاں موجود ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی؛لیکن حدِ نگاہ تک گھنا جنگل تھا جس میں خواتین اور بچوں کے ساتھ چلنا مشکل تھا،سو ایک صبح وہ اس غار سے نکل کر دریا میں اترے اور پانی کے بہاؤ کے الٹی طرف چل پڑے ۔

وہ دو تین دن تک ہرو کے راس میں موجود پتھروں کے بیچ میں سے رستہ بناتے ،اپنے مال واسباب اور خاندان والوں کے ساتھ ،اس نامعلوم منزل کی جانب چلتے رہے،جہاں وہ کسی دشمن کی

فکر سے آزاد ہوکر اپنی زندگی گزار سکیں؛ ان کا رہنما، تنگ دروں سے بل کھا کر گزرتا، دریا تھا۔

جب وہ دوتارہ کے اس مقام پر پہنچے جہاں شمالی اور جنوبی، دونوں ہرو آپس میں ملتے ہیں تو انھوں نے شمالی ہرو کو چنا جس کا پاٹ تنگ اور اس کے گرد اونچے پہاڑ تھے کہ انھیں خدشہ تھا کہ چوڑے پاٹ والے حصے میں انھیں تلاش کرنا آسان ہوگا۔

جوں جوں وہ اس طرف آتے گئے پانی گھٹتا گیا۔ جب وہ سمندر کٹھہ اور ہرو کے ملاپ والی جگہ پہنچے تو وہ وہاں سے مزید شمال کی طرف مڑ گئے کہ ان کے خیال میں اس دشوار گزار درے میں انھیں تلاش کرنا ناممکن تھا۔ وہ کئی دن تک سمندر کھٹہ میں آبشارِ چھتنار کے پاس، اسی جگہ چھپے رہے، جہاں صدیوں بعد، ہم نے سکھوں کے مردِ حر، امر سنگھ مجیٹھیہ کو اس کے سیکڑوں جواں مردوں سمیت اس طرح قتل کرنا تھا کہ دودھیا چھتنار کی گرتی دھاروں نے، کئی گھنٹوں تک لواخ کے سرخ شعلوں کا نظارہ پیش کرنا تھا۔ جب انھیں اطمینان ہوگیا کہ اب وہ اپنے دشمن کی دسترس سے باہر ہیں تو وہ کوہ ناڑہ کی اِس چوٹی کی طرف آگئے؛ یہیں کہیں بستی بسائی اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم انھی جنگجوؤں کی اولاد ہیں۔"

❁

اس کے بعد، اس نوشتے میں ان جنگوں کا احوال ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا، جن سے ہمارے خطے کا چپہ چپہ اور بابا کا نوشتہ بھرا پڑا تھا۔ ابتدا میں ان جنگوں کا ذکر تھا جو وقتاً فوقتاً مقامی حملہ آوروں کے خلاف لڑی گئیں، یہ سارے حملے ریاست پر مغرب کی جانب سے کیے گئے تھے۔ بعد میں ان جنگوں کا احوال تھا، جو سکھوں کے خلاف لڑی گئی تھیں، جو زیادہ تفصیل کے ساتھ درج تھیں، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان سب میں وہ خود بھی شریک رہے۔ کچھ میں تو ان کا کردار، کلیدی رہا۔

آخر میں میجر جیمز ایبٹ کی سجیکوٹ آمد اور حسن علی خان سے ملاقات اور صلح کی تفصیلات درج تھیں۔

میں نے جب وہ نوشتہ پہلی بار پڑھا تھا تو مجھے اس بات پر شدید حیرانی ہوئی تھی کہ بابا نے پورے نوشتے میں، اس کھنڈر حویلی کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا، جہاں فراغت کے دنوں میں وہ

لواخ

استغراق کے عالم میں گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے اور جس سے انھیں ایک خاص طرح کی خوشبو آتی تھی؛ ایسی عجیب وغریب خوشبو جسے ان کے علاوہ اور کوئی محسوس نہ کر سکا البتہ ڈیرے کا ذکر بار بار آیا تھا، جسے انھوں نے سرائے صالح سے خصوصی طور پر سنگ تراش اور معمار بلا کر انھی پتھروں سے تعمیر کرایا تھا، جن سے صدیوں پہلے کسی شخص نے یہ حویلی تیار کرائی تھی لیکن اس کے باوجود ان معماروں کے ہاتھ میں وہ نفاست نہیں تھیں، جو صدیوں پہلے کے معماروں کے ہاتھ میں تھی۔

چھے

مَیں جب بھی پہاڑ کی اس چوٹی کے ماضی کو یاد کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ دن اپنی تمام جزیات کے ساتھ ابھر آتا ہے جب بابا نے درختوں کے گھنے جھنڈ میں، مجھے وہ کھنڈر حویلی دکھائی تھی، جسے دیکھا تو ان سے پہلے بھی بہت سوں نے ہوگا لیکن اسے صحیح معنوں میں دریافت انھی نے کیا تھا، اور جسے ان کے توپوں سے اُڑائے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد، ان کے والد محترم سید محمد خان کی چلہ گاہ سے منسوب ہونا تھا۔

وہ سردیوں کی ایک چمکیلی اور خوش گوار دوپہر تھی۔ میری عمر سترہ اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی اور مجھے دارالعلم مانگل میں داخل ہوئے، غالباً ساتواں سال تھا۔ میں اُس چمکیلی دوپہر سے صرف ایک دن پہلے مانگل سے سردیوں کی چھٹیاں گزارنے بستی آیا تھا۔ رات کے کھانے پر ہمارا پورا خاندان جمع تھا۔ ماں نے میرے لیے خصوصی طور پر سرسوں کے ساگ کی کڑھی بنائی تھی، جو وہ کسی اور کے کھیت سے چنوا کر لائیں تھیں کہ ہمارے کھیتوں میں ابھی سرسوں نے پتے نہیں نکالے تھے۔ سرسوں کے ساگ کی کڑھی؛ مکھن اور مکئی کی روٹی کے ساتھ، مجھے ہمیشہ مرغوب رہی ہے، جس کی خوشبو سونگھے اب مدتیں ہو گئی ہیں کہ یہاں لنگر خانے میں اس نوع کی چیزیں پکانے والا کوئی نہیں۔

یہ وہ دن تھے جب انگریز ہمارے علاقے سمیت پورے ہندوستان کا بلا شرکت غیرے حکمران بن چکا تھا اور کمپنی کی حکومت نے، ایک منصوبے کے تحت پرانی ریاستیں؛ جن پر سکھوں نے قبضہ کر کے سلطنت لاہور میں شامل کر دیا تھا، بحال کر دی تھیں جس کی وجہ سے شورشیں تھم گئیں تھیں۔ فراغت کے یہ

دن، بابا زیادہ تر اپنے ڈیرے پر گزارتے تھے اور رات کو بھی کبھی کبھار ہی گھر آتے تھے۔

اس دن وہ مانگل سے میری آمد کے سبب گھر آئے تھے۔ کھانے کے بعد بھی، ہم کافی دیر تک گپ شپ کرتے رہے اور میں اپنے چچا زادوں کے ساتھ بابا سے گذشتہ جنگوں کے احوال سنتا رہا۔ عشا کی نماز کے بعد جب وہ ڈیرے پر جانے لگے تو مجھے حکم دیا کہ کل دوپہر کے وقت ڈیرے پر آنا، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

باوجود اس کے کہ میں سفری تھکاوٹ سے چور چور تھا، اس تجسس نے کہ بابا نے مجھ سے ایسی کون سی باتیں کرنی ہیں، رات کے پچھلے پہر تک جگائے رکھا۔ اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی اور میں نے منہ سے رضائی سرکائی تو سورج کافی بلندی پر آچکا تھا۔ میں جلدی جلدی ناشتہ کر کے بستی کے عقب میں موجود پہاڑ کے دامن میں واقع ڈیرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ بستی سے ڈیرے کا فاصلہ پیدل چلنے والوں کے لیے نصف میل اور گھڑسواروں کے لیے میل بھر کا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گھوڑوں اور خچروں کے لیے جو راستہ بنایا گیا تھا اس میں شرقاً غرباً دو لمبے لمبے موڑ تھے اور سواروں کو دور سے پھر کے آنا پڑتا تھا؛ پیدل راستہ عمودی تھا، سواری کی صورت میں اس پر سفر کرنا ناممکن تھا۔

❁

میں نے جب ہوش سنبھالا، بابا کو زیادہ تر اسی ڈیرے پر ہی دیکھا۔ میرے بچپن کے ابتدائی دنوں میں، سکھوں کے ساتھ ہماری جنگیں عروج پر تھیں اور یہ سلسلہ میری پیدائش سے بہت پہلے ۱۸۲۲ میں ہونے والی اس جنگ سے شروع ہوا تھا، جو جنگ سمندر کھٹہ کے نام سے مشہور ہے، جس میں رنجیت سنگھ کی فوج کو بری طرح شکست ہوئی تھی اور اس کا مشہور سپہ سالار امر سنگھ مجیٹھیہ اپنی فوج کے ساتھ، مارا گیا تھا، یوں اس کے درباری نجومی کی پیش گوئی جزوی طور پر سچ ثابت ہوئی تھی۔

مہتاب سنگھ نے، جو اس جنگ میں شریک تھا اور جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا، اور جو بعد میں انگریزوں کی طرف سے اس علاقے کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوا، جس کے جواب میں بابا کو اپنے قبیلے کی تاریخ ایک نوشتے کی صورت محفوظ کرنے کا خیال آیا تھا، میرے بابا کو بتایا تھا کہ جب

سرائے صالح میں بیٹھ کر ہم اس حملے کے بارے میں صلاح مشورہ کر رہے تھے، امر سنگھ نے میری موجودگی میں کرشن داس کو طلب کیا، جو اس دور کا ایک ماہر نجوم تھا۔ امر سنگھ نے اسے حکم دیا کہ وہ اس جنگ کا زائچہ تیار کرے اور حملے کی شبھ گھڑی کا تعین کرے۔ دوسرے روز اس نے امر سنگھ کو بتایا کہ آپ جب چاہیں بے دھڑک حملہ کر دیں آپ کو کچھ نہیں ہوگا کیوں کہ زائچے کے مطابق آپ کی موت سمندر میں واقع ہوگی۔ امر سنگھ یہ سن کر خوش ہوا اور اس نے اگلے ہی دن حملے کا حکم دے دیا۔

جنگی حکمت عملی کے تحت ہمارے قبیلے نے راتوں رات بستی خالی کر دی تھی اور تمام خواتین، بزرگ اور بچے، اس زمین دوز پناہ گاہ میں منتقل کر دیے گئے تھے، جس کی سکھ افواج کے نجومیوں کو تو کیا، فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔

ہمارے قبیلے کے جنگجو جن کی سربراہی حسن علی خان خود کر رہے تھے، انھیں گھیر گھار کر سمندر کھٹہ میں لے گئے تھے، جہاں ان کا ایک دستہ آبشارِ چھتنار کی مشرقی سمت واقع گھنے جنگل میں پہلے سے گھات لگائے بیٹھا تھا، جوں ہی سکھ فوج آبشارِ چھتنار پر پہنچی، مشرق اور مغرب دونوں طرف سے ایک ساتھ حملہ کیا گیا اور انھیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ سمندر کھٹہ کئی گھنٹوں تک خونی ندی کا منظر پیش کرتا رہا اور وہی لوگ جو دوپہر کے وقت آبشارِ چھتنار کی دودھیا دھاروں کے نظارے میں محو تھے، عصر کے وقت، آسمان کی طرف پرواز کرتی ان کی روحوں نے، ان دھاروں کو سرخ شعلوں کی طرح گرتے دیکھا تھا؛ جیسے کسی نے لواخ کو فضا میں اوندھا کر کے اس میں کاہو کی لکڑیوں اور چیڑ کی ڈھیلوں کے گٹھڑے جھونک دیے ہوں۔

امر سنگھ میرے بابا کے وار سے زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا تھا۔

''اس نے ڈھال سے میری تلوار روک کر پوچھا تھا کہ اس جگہ کا نام کیا ہے، میں نے دوسرے وار کے لیے تلوار کو پیچھے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا تھا سمندر کٹھہ۔ اس سمے میں نے اس کے چہرے پر ایک سراسیمگی سی دیکھی؛ اگلے ہی لمحے میں نے اسے کاری ضرب لگائی اور وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔'' میرے بابا نے اپنے نوشتے میں، جو حسن علی خان کی خصوصی فرمائش پر ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا، لکھا تھا۔

یہ سکھ افواج کے ساتھ ہماری پہلی جنگ تھی، جس نے دشمن پر ہماری ایسی ہیبت طاری کر دی تھی کہ وہ اپنے سپہ سالار کی لاش لینے بھی ایک مہینے کے بعد، سرائے صالح کے ہندوؤں کو بطور وکیل ساتھ لے کر آیا، جب وہ گل سڑ چکی تھی۔

اس کارنامے نے بابا کو، جو اس سے قبل ایک عام جنگجو تھے، راتوں رات ایک سورما بنا دیا تھا اور وہ پورے قبیلے کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ اس کے بہت عرصے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا، اس وقت بھی ان کی یہ حیثیت برقرار تھی؛ نتیجتاً ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس پناہ گاہ کو، جس میں دوران جنگ بستی کے بچوں اور خواتین کو چھپایا گیا تھا، ڈیرے میں تبدیل کر دیا گیا، جہاں ان سے ملنے جلنے والوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا، جس کی وجہ سے شروع میں انھیں مالی مشکلات نے آ گھیرا تھا لیکن جلد ہی حسن علی خان نے اس کا یہ حل نکالا گیا کہ ان کے ڈیرے کے نصف اخراجات مختلف بستیوں میں بٹا ہمارا قبیلہ اور نصف وہ خود اٹھائیں گے۔

درجن بھر کمروں اور کشادہ صحن پر مشتمل اس ڈیرے کی سب سے عجیب بات اس کا زمین دوز ہونا تھا۔ اسے ایک بڑے گڑھے میں تعمیر کیا گیا تھا، یوں اس کے چاروں طرف قدرتی طور پر ایک چار دیواری تھی اور اس کی چھت اردگرد کی زمین سے ایک دو فٹ نیچے تھی یہی وجہ تھی کہ صرف سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں کوئی عمارت موجود ہے۔ جنگ کے دنوں میں اس کی چھت پر جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں کاٹ کر پھینک دی جاتی تھیں اس لیے اگر دشمن سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر بھی پہنچ جائے تو بھی وہ اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میرے بچپن میں یہ ڈیرا ہر وقت اردگرد سے آئے ہوئے لوگوں سے بھرا رہتا تھا، جن کے کھانے پینے کا بندوبست بھی یہیں کیا جاتا تھا اور یہ بندوبست رضاکارانہ طور پر ہمارے قبیلے کے لوگ کرتے تھے۔ ان رضاکاروں کی تعداد اکیس تھی اور ہر روز تین آدمی یہ کام سرانجام دیتے تھے۔ ان کے دن طے تھے اور وہ اپنے اپنے طے شدہ دن، صبح سویرے وہاں پہنچ جایا کرتے تھے؛ ہاں اگر کوئی شخص مقررہ دن بیمار ہو جاتا تو اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص وہاں پہنچ جاتا۔ ان لوگوں کی یہ بھی ذمے داری تھی کہ وہ

لواخ

اردگرد کے علاقے پر نظر رکھیں اور کسی بھی طرف سے اگر کوئی شخص پیدل یا سوار ادھر کو آتا دکھائی دے تو اس کی اطلاع فوراً بابا کو دیں، چاہے وہ ڈیرے پر ہوں یا گاؤں والے گھر میں۔ بابا اور بڑے چچا جو ایک طرح سے لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے، جب بھی بستی سے باہر جاتے، چھوٹے چچا ان کے قائم مقام بن جاتے اور اس صورت میں اس کی اطلاع انھیں دی جاتی۔

جن دنوں دور دراز کے کسی محاذ پر جنگ جاری ہوتی، یہ ڈیرا بسا اوقات کئی کئی دن تک ویران پڑا رہتا۔ ایسے دنوں میں بھی وہاں دو آدمی ہر وقت موجود رہتے؛ جن میں سے ایک سوتا اور دوسرا جاگتا رہتا۔ رات کو جاگنے والا مکان کی چھت پر بنی ایک ممٹی پر بیٹھا رہتا، جہاں سے وہ دور دراز کے پہاڑوں پر نظر رکھتا۔ اگر مسیاڑی، نتھیا گلی، ڈبران، دناہ اور کوہمل وغیرہ کے پہاڑوں میں سے کسی کی چوٹیوں پر مختص کردہ کسی جگہ پر، اسے لواخ کے شعلے دکھائی دیتے تو یہ بات اس کے فرائض میں شامل تھی کہ وہ ڈیرے کے چولھے میں دبے انگارے تازہ کرے اور چیڑ کی ڈھیوں کی مشعلیں سلگا کر فوراً اسی پہاڑ کی چوٹی پر، ڈیرے سے میل بھر کے فاصلے پر موجود لواخ روشن کرے۔ یہ لواخ پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسی جگہ بنایا گیا تھا جہاں سے نہ صرف ہماری بستی کا ہر گھر نظر آتا تھا بلکہ پہاڑ کے اردگرد موجود دوسرے تمام گاؤں بھی اس سے نکلنے والے شعلوں کو بآسانی دیکھ سکتے تھے۔

ڈیرے پر بچوں کا آنا جانا، خاص کر اُن دنوں میں، جب وہاں مہمان ٹھہرے ہوئے ہوں، منع تھا، سو میں بھی کبھی کبھار ہی وہاں جاتا تھا۔

❁

ڈیرے کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چڑھائی چڑھتے ہوئے، میں نے ایک نظر سورج کی طرف دیکھا اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کل چھوٹے چچا کے ساتھ مانگل سے آتے ہوئے میں اس وقت کہاں پہنچا تھا۔ دور نتھیا گلی کی چوٹی سے سورج کی بلندی کو ناپتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ کل ہم اس وقت نئے نئے بسائے جانے والے شہر ایبٹ آباد سے گزر آئے تھے شاید اُس درے میں داخل ہو چکے تھے جہاں پانی کا ایک بڑا چشمہ ہے اور ہم پانی پینے اور سستانے کے لیے

وہاں کچھ دیر رکے تھے۔

کل کے سفر کی وجہ سے میری ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔گھوڑے کا سفر شروع میں تو بہت لطف دیتا ہے لیکن لمبا سفر ٹانگوں کو اکڑا دیتا ہے۔گھوڑے کے چوڑے پیٹ پر ٹانگیں پھیلا کر زیادہ دیر بیٹھنا خاصا مشکل کام ہے، خاص کر اس وقت جب آپ اترائی کے سفر پر ہوں۔اسی تھکاوٹ کی وجہ سے میں رات بستر پر جاتے ہی گھوڑے بیچ کر سو گیا تھا۔

جب میں ڈیرے کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو ماں نے اصرار کیا کہ گھوڑے پر چلے جاؤ لیکن میں، جسے ہمیشہ گھڑسواری کا شوق رہا ہے اس سے اکتا گیا تھا سو پیدل چلنے کو ترجیح دی۔

جب میں سیڑھیاں اتر کر زمین دوز ڈیرے میں داخل ہوا تو بابا کے کمرے سے گفتگو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔میں ان کے دروازے کے آگے سے گزر گیا کہ بڑوں کی باتوں میں مخل ہونا مجھے مناسب نہیں لگا۔انھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا سو مجھے آواز دی۔

آواز سن کر میرے قدم تو رک گئے تھے لیکن میں ابھی تذبذب کا شکار تھا کہ اسی کمرے سے ایک آدمی نکلا اور مجھے اندر بلا لیا گیا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے ان لوگوں سے میرا تعارف کرایا، میں نے سلام کرتے ہوئے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور پھر کمرے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔وہ ارد گرد کی بستیوں کے خوانین، مقدم اور سردار تھے۔گفتگو کا موضوع انگریزوں کا طرز حکمرانی تھا، جس سے بیشتر لوگ مطمئن تھے کہ انھیں، ان کی وہ آبائی جاگیریں، جو سکھوں نے ضبط کر لیں تھیں، واپس کر دی گئی تھیں۔ بابا اور چند دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ ہمارا پالا ایک چالاک اور عیار دشمن سے پڑا ہے، جو ایک ہی قبیلے کے مختلف لوگوں میں پھوٹ ڈال رہا ہے، اور خود لڑنے کے بجائے انھیں آپس میں لڑا رہا ہے، جس کے مستقبل میں سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔گفتگو ابھی کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچی تھی کہ ساتھ والے کمرے میں کھانا پروسا جا چکا تھا۔

کھانا کھا کر بابا نے مہمانوں کو رخصت کیا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے ڈیرے کی چھت پر

جانے والی پتھریلی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔میں سمجھا کہ وہ چھت پر جا کر مجھ سے علاحدگی میں کوئی بات کرنا چاہ رہے ہیں لیکن ان کے قدم پہاڑ کی چوٹی پر موجود میدان کی جانب جانے والی پگڈنڈی کی طرف اٹھ رہے تھے؛ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا، مجھے لگا شاید وہ مجھے دادا کے مقبرے پر لے جانا چاہتے ہیں۔

میل بھر کا بل کھاتا راستہ طے کرنے کے بعد، جب ہم اس دیو قامت چٹان کے قریب پہنچے، جہاں سے رستہ دائیں سمت مڑتا تھا اور ایک چھوٹا سا موڑ کاٹ کر میدان میں داخل ہوتا تھا، میں یکا یک ٹھٹھکا۔وہ رستہ چھوڑ کر بائیں سمت مڑ گئے، جہاں سنتھے اور سنبل کی جھاڑیاں تھیں اور ہمیں جھاڑیوں کو ہاتھوں سے ہٹا کر اور پاؤں سے کچل کر خود راستہ بنانا پڑ رہا تھا، سوا سو قدم چلنے کے بعد ہم کاہو کے درختوں کے ایک ایسے جھنڈ میں داخل ہو گئے جن پر جھل کی خاردار بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔درختوں کے نیچے گری ہوئی جھل کی خشک شاخوں اور کاہو کے سوکھے پتوں پر جب ہمارے پاؤں پڑتے تو ان کے ٹوٹنے سے ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی، جو اس آواز سے بالکل مختلف تھی، جو کچھ دیر پہلے سنتھے اور سنبل کی جھاڑیوں کی شاخیں ٹوٹنے سے پیدا ہو رہی تھی۔

مجھے کبھی اس طرف آنے کا موقع نہیں ملا تھا۔میں متجسس تھا کہ بابا مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔

اچانک مجھے درختوں کے جھنڈ میں ایک بالکل ہموار اور سیدھی چٹان سی دکھائی دی، جو تقریباً چار گز اونچی اور اسی پچاسی گز لمبی تھی؛ جس کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اڑ بمبل کی سبز بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔اڑ بمبل کے پتے اتنے سبز تھے کہ ان پر سیاہ ہونے کا گمان گزرتا تھا۔یہ بیل ہمارے ہاں کسیوں اور نالوں کی کھائیوں میں ان جگہوں پر اگتی ہے جہاں دھوپ کم کم پڑتی ہے اور زمین میں نمی برقرار رہتی ہے۔یہ جگہ اگر چہ بلندی پر تھی لیکن کاہو کے سدا بہار درختوں کے گھنے سائے نے اسے یہاں اگنے اور پھیلنے میں مدد دی تھی۔میں قدرت کے اس کرشمے پر حیران تھا، میں نے اس سے بھی کہیں اونچی چٹانیں دیکھ رکھی تھیں لیکن دیوار کی طرح سیدھی چٹان میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

جب ہم چلتے ہوئے چٹان کے وسط میں پہنچے تو بابا نے جیب سے ایک کمانی دار چاقو نکالا، بیل کو ایک جگہ سے کاٹا اور اس کا ایک سرا، اپنے ہاتھ میں پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ دور تک چٹان سے ادھڑتی

چلی گئی۔ بیل ہٹی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں یہ چٹان نہیں، انسانی ہاتھوں سے چنی گئی ایک طویل دیوار تھی، جس میں چنے گئے پتھر اس کے تعمیر کنندگان کی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمارے علاقے کا سب سے عالی شان مکان، ہمارا ڈیرا تھا، جسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے اور ہر سال اس کی لیپائی عام عورتوں کے بجائے، ماہر کاریگروں سے کرائی جاتی تھی، تا کہ اس میں نفاست پیدا کی جا سکے۔ جب نئی لیپائی کے لیے گارے کے لپرے اتارے جاتے تھے تو اس کی خوبصورت چنائی میری آنکھوں کو بہت بھلی لگتی تھی لیکن اس صدیوں پرانی چنائی کی نفاست کا مقابلہ وہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ہماری بستی کے مکانوں کے برعکس، اس کے پتھر نہایت مہارت سے تراشے گئے تھے، بڑے پتھروں کے درمیان چھوٹے پتھروں کو اتنے قرینے اور مہارت سے چنا گیا تھا کہ درزوں کو بند کرنے کے لیے کسی گارے کی ضرورت ہی نہیں تھی البتہ اس کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے درمیان ہلکی ہلکی مٹی تھی جس پر کائی جمی ہوئی تھی؛ بیل کی جڑیں اسی مٹی میں پیوست تھیں۔ میں کافی دیر تک مبہوت کھڑا دیوار کو دیکھتا رہا تھا۔ اتنے میں بابا نے، جو مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہے تھے، مجھے اشارہ کیا اور میں، جس کا دل ابھی اس نظارہ سے بھرا نہیں تھا، ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

دیوار کے کونے میں جا کر وہ دیوار کے ساتھ بائیں طرف مڑ گئے۔ دوسری طرف بھی ویسی ہی دیوار تھی، جس کا کچھ حصہ گرا ہوا تھا؛ وہ گری ہوئی دیوار سے اندر کی طرف مڑ گئے، جہاں کمروں کی ایک لمبی قطار کے آثار تھے۔

ہر کمرے کے اندر درخت اگے ہوئے تھے، جن میں سے کچھ کے ساتھ جھل کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ کاہو کے درختوں کے بل کھاتے موٹے تنوں اور دیواروں پر سے گرے ہوئے تراشیدہ پتھروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ جا کھڑے ہوئے، جہاں نسبتاً کم درخت تھے۔ اندر کی طرف بھی تمام دیواروں پر وہی سبز بیل لپٹی ہوئی تھی، جس نے چھاؤں کو اتنا گھنا کر دیا تھا کہ دوپہر کو بھی یہاں گہری شام کا سا سماں تھا۔

کافی دیر غور کرنے اور چاروں طرف دیکھنے کے بعد مجھ پر کھلا کہ ہم ایک ایسی قدیم حویلی کے

کھنڈر میں کھڑے ہیں، جس کے ہر کمرے میں پتھر سے تراشا ہوا ایک بت بھی موجود ہے، سارے بت ایک ہی شکل کے تھے، جیسے یہ کسی ایک ہی شخص کی شبیہیں ہوں لیکن ان کی جسامت مختلف تھی۔ جب مزید غور کیا تو دیواروں کے ساتھ بھی نقش و نگار سے بنے دکھائی دیے، جن میں اسی نامعلوم شخص کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ میں خاصی دیر تجسس بھری حیرانی کے ساتھ انھیں غور سے دیکھتا رہا اور بابا مجھے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اُن کی طرف کن اکھیوں سے دیکھا؛ وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے اور میرے اس انہماک پر بہت خوش دکھائی دے رہے تھے؛ ان کے چہرے پر ایسی رونق تھی، جیسے وہ کسی ایسے محاذ سے سرخرو لوٹے ہوں، جس میں سرخروئی کا انھیں ابھی تک یقین نہ آیا ہو۔

حویلی کی چھت تو مدتوں پہلے ڈھہہ چکی تھی لیکن اس میں اگے ہوئے کاہو کے درختوں کی گھنی شاخوں اور ان سے لپٹی جھل کی بیل نے اسے قدرتی چھت فراہم کر دی ہے۔ ان درختوں کی ٹہنیاں میدان کے سرے سے سر نکالے ہوئے تھیں، جن کے پتے اتنے گھنے تھے کہ وہاں سے نیچے دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

بیشتر کمروں کی دیواریں گری ہوئی تھیں اور ان کے پتھر کمروں میں پڑے ہوئے تھے لیکن بغور دیکھنے سے کمروں کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت دیواروں کی چوڑائی پر ہو رہی تھی۔ ہر دیوار کم سے کم ایک گز چوڑی تھی؛ اتنی چوڑی دیوار ہمارے گاؤں میں کسی بھی گھر کی نہیں تھی، حتیٰ کے ہمارے ڈیرے کی بھی نہیں، جو ہماری بستی ہی کی نہیں اس پورے علاقے کی سب سے عالی شان عمارت تھی۔ آثار سے لگتا تھا کہ ہر کمرے کے آگے ایک برآمدہ بھی تھا، جس کے ستون کنجور کے پتھروں سے تراشے گئے تھے، جو بالکل اسی طرح مدور تھے، جیسے ہمارے ہاں درختوں کے مدور تنے، ستون کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ تین ستون اب بھی پوری استقامت کے ساتھ کھڑے تھے لیکن باقی زمین بوس ہو چکے تھے۔

بیشتر کمروں کے رخ شمال کی طرف تھے لیکن کچھ کمرے جنوبی رخ پر بھی بنے ہوئے تھے، جن کی پچھلی دیواروں میں طاق بھی تھے؛ بالکل اسی طرح، جس طرح ہماری بستی کے گھروں میں چراغ جلانے

کے لیے بنائے جاتے تھے۔

''چلوآؤ۔ چلتے ہیں۔ پھر کبھی آ کے دیکھ لینا۔ابھی میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' بابا نے کہااور واپس اسی سمت چل دیے جس طرف سے ہم اس کھنڈر کے اندر داخل ہوئے تھے۔

جوں ہی ہم چار دیواری سے باہر نکلے اور الٹی سمت کو مڑے سنتھے اور جنگلی انار کی جھاڑیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ بابا نے جھاڑیوں کو ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ ان میں باقاعدہ زینہ بنا ہوا ہے جو اوپر کی طرف جاتا ہے، یہ زینہ کنجور کے کھردرے پتھروں کا تھا، بالکل ہمارے ڈیرے کے فرش جیسا کھردرا؛ جس کی بابا نے کبھی لیپائی نہیں ہونے دی۔ابھی ہم نے دو تین زینے ہی پھلانگے تھے کہ آگے کاہو کے ٹیڑھے میڑھے ڈالوں نے ہمارا راستہ روک لیا، جس کی وجہ سے مجھے زینے چڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی، بابا زینے کے بجائے ڈال پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئے؛ میں نے بھی ان کی پیروی کی۔مزید چار پانچ زینے چڑھنے کے بعد ہم اس میدان میں تھے، جہاں دادا کا مقبرہ تھا۔آخری زینے پر کھڑے ہو کر میں نے اندازہ لگایا کہ اگر اس کھنڈر کی، جگہ جگہ سے گری دیواروں کو اوپر سے برابر کر کے، چھت ڈال دی جائے تو یہ چھت اس وسیع میدان کا حصہ معلوم ہونے لگے، بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے زمین دوز ڈیرے کی چھت؛ اس فرق کے ساتھ کہ اس کی مغربی اور جنوبی سمتیں، ہمارے ڈیرے کے برعکس زمین دوز نہیں ہوں گی۔

ہم نے دادا کی قبر پر فاتحہ کی اور وہاں سے چلتے ہوئے میدان کے مشرقی سرے پر آ گئے تھے، جہاں سے باڑہ گلی، نتھیا گلی، ڈونگا گلی، چھانگلا گلی اور کوزہ گلی کی چوٹیاں دھوپ میں نہائی ہوئی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ان کے درمیان وہی درے تھے، جہاں کچھ عرصے بعد، مری میں ہونے والی بغاوت کے وقت، ان باغیوں کو پناہ لینی تھی، جن پر قابو پانے کے لیے سرکار کو ایبٹ آباد اور پنڈی سے اضافی نفری منگوانے کی ضرورت پڑنا تھی اور بغاوت کو مکمل طور پر کچلنے کے بعد، اسے ہمارے قبیلے سے مستقبل میں اٹھنے والی کسی ممکنہ بغاوت کے پیش نظر، چھ چھاؤنیاں قائم کرنا تھیں؛ انگریز سرکار کی طرف سے اتنے کم فاصلے پر، اتنی زیادہ چھاؤنیوں کے قیام کی مثال پورے ہندوستان میں آج بھی کہیں اور نہیں ملتی۔

لواخ

ان واقعات کو رونما ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا اور ہم دونوں کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ عنقریب ایسا ہونے والا ہے۔ امر سنگھ کا درباری نجومی، کرشن داس اگر اس وقت ہمارے ساتھ ہوتا تو شاید وہ کوئی ایسی پیش گوئی کرتا، جو جزوی طور پر ہی سہی، بعد میں سچ ثابت ہوتی۔

ہمیں تو اس وقت اپنے بزرگوں نے گھیرا ہوا تھا اور ہم کچھ ہی دیر بعد اسی میدان کے دوسرے سرے پر پتھروں سے بنے لواخ کے کنارے بیٹھ کر، کھنڈر حویلی سے جڑے اپنے ممکنہ ماضی کو کریدنے والے تھے۔ اس ممکنہ ماضی کو، جس کے بارے میں ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، بس کچھ اندازے تھے کچھ قیاس آرائیاں تھیں جیسے؛ کوئی مستقبل کے بارے میں اندازے لگاتا ہے، قیاس آرائیاں کرتا ہے۔ بابا کے پاس تو پھر بھی ایک دلیل تھی کہ انھیں اس کھنڈر سے بزرگوں کی خوشبو آتی تھی۔ مجھے تو وہاں سے ایسی کوئی خوشبو نہیں آئی تھی ہاں اگر بہار کا موسم ہوتا تو شاید جھل کی بیل پر کھلے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو مجھے اپنی طرف ضرور متوجہ کرتی۔ میں تو اس دن بس صدیوں پرانے معماروں کی کاری گری پر حیران تھا؛ اس حیرانی میں کچھ اضافہ بابا کی باتوں نے بھی کیا تھا۔

سات

''میرا خیال ہے جب ہمارے آباو اجداد مارگلہ کی پہاڑیوں سے اپنی جانیں بچا کر دریائے ہرو کے رستے سمندر کھٹہ پہنچے تو آگے راستہ نہ پا کر، آبشارِ چھتنار کے مقام سے، اس پہاڑ پر چڑھ آئے اور انھوں نے پہلی بستی یہیں کہیں بسائی۔'' بابا نے بجھے ہوئے لواخ کے کنارے بیٹھتے ہوئے کہا، جو اس سے پہلے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں مرتبہ ضرور روشن ہوا ہوگا لیکن اس دن کے تینتیس سال بعد، جب ان کی ہڈیاں بھی گل سڑ چکی تھیں، میں اسے آخری بار روشن کرنے والا تھا۔

یونانی جنگجوؤں کی یہ کہانی؛ جس کا ذکر انھوں نے، بعد ازاں اپنے نوشتے میں اپنے آباو اجداد کی تاریخ کے طور پر کیا تھا، وہ مجھے اس سے پہلے بھی کئی بار سنا چکے تھے اور ہر بار یہ کہانی سناتے ہوئے اس میں کوئی نہ کوئی اضافہ ضرور کرتے تھے، جس کی وجہ سے اس کہانی میں میری دلچسپی، ہمیشہ قائم رہی تھی۔

''۔۔۔پھر جب انھوں نے مستقل طور پر یہیں رہنے کا منصوبہ بنایا تو یہ شاندار عمارت تعمیر کی؛ مجھے یہ ان کا معبد خانہ لگتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی مسجدیں اپنے گھروں سے زیادہ خوبصورت بناتے ہیں اسی طرح انھوں نے یہ معبد خانہ انتہائی شاندار بنایا۔ اس پر انھوں نے بہت محنت کی اور ان ستونوں اور چوڑے زینوں میں استعمال ہونے والے بھاری پتھر، وہ عین اس جگہ سے اٹھا کر لائے، جہاں اب ہمارا ڈیرا ہے۔ تمھیں وہاں سے اتنے بھاری پتھر اٹھا کر میل بھر کی اس بلندی پر لانا ایک ناممکن سی بات لگ رہی ہوگی لیکن مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ پتھر وہیں سے نکالے گئے ہیں کہ کنجور کا پتھر، جو اس حویلی کے ستونوں میں استعمال ہوا ہے، اس پورے علاقے میں اور کہیں نہیں پایا جاتا اور اس جگہ تو بالکل بھی

نہیں جہاں یہ کھنڈر ہے۔

جہاں اب ہمارا ڈیرا ہے یہاں ایک بڑا گڑھا ہوا کرتا تھا، جو دیکھنے میں قدرتی لگتا تھا اور بارش کے دنوں میں ایک گدلے تالاب کا منظر پیش کیا کرتا تھا۔گاؤں کے لوگ جب بھیڑ بکریاں اور مال مویشی چرانے ادھر کو آتے تو یہیں سے انھیں پانی پلایا کرتے تھے۔ایک دفعہ پانی پیتے ہوئے دو بیل اس میں گر گئے تھے، پوری بستی انھیں نکالنے کے لیے جمع ہوئی لیکن ہم لوگ انھیں زندہ نکالنے میں ناکام رہے۔ پھر اس گڑھے کے ایک طرف نالی کھود دی گئی تاکہ اس میں بارش کا پانی جمع نہ ہو سکے اور دوبارہ کسی ایسے نقصان سے بچا جا سکے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ یہ گڑھا قدرتی نہیں تھا، یہ اس معبد خانے کی تعمیر کے لیے، یہاں سے نکالے جانے والے پتھروں کی وجہ سے بنا تھا اور جن لوگوں نے وہاں سے یہ پتھر نکالے تھے، وہی ہمارے اجداد تھے۔انھوں نے بھی ہماری طرح بے شمار جنگیں لڑی ہوں گی؛ تبھی ان کی نسلوں نے یہاں صدیاں گزاریں۔ پھر انھیں ناقابل شکست دیکھ کر ان کے دشمنوں نے ان پر حملے کرنا چھوڑ دیے ہوں گے؛ جب حملوں کا خطرہ ٹل گیا ہوگا تو انھوں نے اس پتھریلی جگہ کو چھوڑ کر، پہاڑ کے نشیب میں ان علاقوں کو چنا ہوگا، جہاں پانی وافر مقدار میں موجود تھا اور زمین بھی زرخیز تھی۔''

''میرے دادا کاجا خان کے زمانے تک ہمارا علاقہ خود مختار تھا''انھوں نے اپنے قبیلے کی کہانی کے تانے بانے دوبارہ ملائے۔

''ہرو کی اس شاخ کے اردگرد کا علاقہ، جس کا منبع ملاچھ اور سمندر کھٹہ ہیں، صدیوں سے ہماری جاگیر ہے، جسے ہمارے قبیلے کے مختلف خاندانوں نے آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ دوسری ہرو جو کوہ دناہ اور سیر کے اردگرد کے چشموں اور آبشاروں سے مل کر بنتی ہے، اس پر صدیوں سے میرے ننھیال کی اجارہ داری ہے۔ یہ دونوں قبیلے صدیوں سے ایک دوسرے کے حلیف ہیں اور ایک دوسرے میں رشتے ناطے کرتے چلے آئے ہیں۔

یہ سلسلہ کب شروع ہوا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے

آباواجداد یہاں آئے ہوں تو یہ قبیلہ پہلے سے یہاں مقیم ہو اور اس نے ان کا خیر مقدم کیا ہو؛ یا خیر سگالی کا پیغام بھیجا ہو اور اسی خیر سگالی کے جذبے کے تحت، ان میں رشتوں کا لین دین شروع ہوا ہو۔ ممکن ہے ہمارے قبیلے نے، جس کے بیشتر افراد جنگ میں کام آگئے تھے اور ان میں خواتین کی زیادہ تعداد تھی، رشتہ دینے میں پہل کی ہو اور یہ سلسلہ چل نکلا ہو، جو آج تک جاری وساری ہے؛ ورنہ دوسرے قبائل میں آج تک اس کا رواج نہیں۔ خاندان اور برادری سے باہر رشتہ دینا ہمارے ہاں آج بھی برا سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ نائی صرف نائیوں میں اور موچی صرف موچیوں میں رشتوں کا لین دین کرتے ہیں، ان کے ہاں بھی کسی دوسری برادری میں شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

جب شروع میں دونوں قبیلوں کے درمیان رشتوں کا لین دین شروع ہوا اور مخلوط نسلیں پروان چڑھنے لگیں تو کسی سیانے جنگجو نے یہ بھانپ لیا ہوگا کہ میدانِ جنگ میں وہ جنگجو زیادہ دادِ شجاعت دیتے ہیں، جن کا خون ایک قبیلے سے ہو اور دودھ دوسرے قبیلے سے؛ یوں یہ سلسلہ زیادہ تواتر سے چل نکلا۔ یہ بات میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں؛ حسن علی خان سمیت اس قبیلے کے تمام جری اور بہادر لوگوں نے میرے ننھیالی قبیلے کی ماؤں کا دودھ پیا ہوا ہے اسی طرح اُس قبیلے کے جتنے بھی بڑے جنگجو ہیں، ان کی مائیں ہمارے خاندان سے ہیں۔ تمھاری سوتیلی ماں کا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہے، لیکن خدا نے مجھے اس سے اولاد نہیں دی اور مجھے تمھاری چھوٹی ماں سے دوسری شادی کرنا پڑی۔

یہ دونوں قومیں صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہی ہیں چھوٹے موٹے جھگڑوں کے علاوہ ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی جنگ نہیں چھڑی اور اس نوع کی چھوٹی موٹی لڑائیاں تو اپنے خاندان اور برادری میں بھی چلتی ہی رہتی ہیں۔ جب بھی باہر سے کوئی حملہ ہوتا یہ دونوں مل کر مقابلہ کرتے۔ ان دونوں کی شادی بیاہ اور موت فوت کی رسمیں بھی ایک جیسی ہی ہیں؛ شاید اس کی وجہ بھی باہمی رشتوں کا لین دین ہے۔

ان علاقوں میں موجود ہندو اور سکھ بھی بیرونی حملوں کی صورت میں ان قبیلوں کا ساتھ دیتے چلے آئے ہیں، یہاں تک کہ جب رنجیت سنگھ کی افواج نے ہم پر حملہ کیا تو مقامی سکھوں نے ان کا ساتھ

نہیں دیا۔ان کا جھکاؤ ہمیشہ اُسی طرف رہا ہے،جس طرف یہ دونوں حلیف قبیلے رہے۔مقامی راجاؤں نے جب ہمارے قبیلے پرحملہ کیا تو میرا ننھیالی قبیلہ بھی اس لڑائی میں ان کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔فتح کے بعد جب ہمارے بڑوں نے انھیں پیش کش کی کہ وہ اس کے بدلے ہماری کچھ زرخیز زمینیں رکھ لیں تو انھوں نے یہ کہہ کرانھیں شرمندہ کیا کہ ہمیں جو توفیق ہو ہم اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو دیتے ہیں،ان سے لیتے نہیں۔

ہمارے ڈیرے نے موجودہ شکل بہت بعد میں اختیار کی۔اس سے بہت پہلے،سکھ دور کے ان ابتدائی دنوں میں،جب انھوں نے میدان ہزارہ پرقبضہ کیا تھااورہمیں بستی سے باہر،ایک ایسی پناہ گاہ کی ضرورت محسوس ہوئی،جہاں ہم بستی کے بچوں،بوڑھوں اور خواتین کوحملہ آوروں سے چھپا کر رکھ سکیں، اس کی تعمیر کی گئی تھی۔راتوں رات تعمیر ہونے والی اس زمین دوز پناہ گاہ کی تعمیر کا خیال،پہلے پہل میرے ماموں شیر بہادر خان ہی کو آیا تھااور انھی نے اس کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا،جس میں ان کی برادری کے افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

اپنے محل وقوع اور زمین دوز ہونے کی وجہ سے دشمن کی نظر اس پر نہیں پڑسکتی تھی۔آج بھی اُس وقت تک یہ کسی کی نظروں میں نہیں آسکتا،جب تک کوئی اسے سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بغور نہ دیکھے۔جنگ کے دنوں میں،ہم اس کے اوپر سبز ٹہنیاں کاٹ کر پھیلا دیتے تھے۔اگر کوئی جاسوس ٹوہ لگا کر اس کا پتہ لگا بھی لیتا تو بھی اس کے دونوں اطراف موجود گہری کھائیاں،اسے محفوظ رکھتی تھیں۔اس پر حملے کا واحد راستہ پہاڑ کی یہ چوٹی تھی،جس پر دن رات ہمارے کچھ نوجوان گشت کرتے رہتے تھے تاکہ خطرے کی صورت میں وہ لواخ روشن کر کے اس کی اطلاع بستی تک پہنچا سکیں۔

جب اس ڈیرے کی تعمیر کا منصوبہ بن رہا تھا،میری عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔جنگ اگرچہ ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی،لیکن جب میدان ہزارہ میں سکھوں کے حملے کی خبر پہنچی تو پورے علاقے میں خوف وہراس پھیل گیا۔ہمارے بڑوں نے سوچا کہ اگر محمد خان ترین،جو میدانی علاقے کا ایک طاقت ور خان تھا،ان کا مقابلہ نہیں کر سکا تو ہمارے لیے اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔سکھ؛دناہ اور پھڑیلا کے اس طرف پنجاب کے میدانی علاقے میں پوری طرح قابض ہو چکے تھے اور یہ خبر بھی گرم تھی کہ

انھوں نے کشمیر پر قبضہ کر کے اسے والی لاہور رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا ہے۔ رنجیت سنگھ کی راجدھانی مغرب میں پشاور تک پھیل چکی تھی۔

ان پے در پے فتوحات کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس ایک بڑی اور منظم فوج تھی، جو تیز دھار تلواروں، تیروں، نیزوں اور بھالوں کے ساتھ ساتھ توپوں اور ٹوپے دار بندوقوں سے بھی لیس تھی۔ وہ جس علاقے پر حملہ کرتا، وہاں اپنا ایک گورنر مقرر کر دیتا۔ میدان ہزارہ میں بھی اس نے مکھن سنگھ کو اپنا گورنر بنا دیا تھا، جو روز بروز اپنی راجدھانی کو وسیع کر رہا تھا اور جلد یا بدیر اس نے اس علاقے پر حملہ کرنا تھا۔

اس ممکنہ حملے کے خدشے کے پیش نظر ہماری بستی کے لوگ ایک شام بستی کی مسجد میں جمع ہوئے، مجھ سمیت بستی کے سارے نوجوان بھی وہاں موجود تھے، مولوی صاحب نے، جو پیران دھماچوکڑی کے عزیزوں میں سے تھے اور جن سے میں نے بچپن میں قرآن اور دوسری کتابیں پڑھیں تھیں، ایک جوشیلی تقریر کی۔ اس کے بعد پیرِ دھماچوکڑی شریف نے ایک طویل خطبہ دیا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ ان غیر مسلموں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا، جہاد ہے اور دوران جنگ مرنے والا شہید ہوگا اور اسے جنت میں ایک بڑا محل دیا جائے گا۔ باوجود اس کے کہ پیر دھماچوکڑی نے کچھ عرصہ قبل ہمارے قبیلے کی طرف سے مقامی راجہ کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں، راجہ کا ساتھ دیا تھا اور بستی کے بہت سے لوگ انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے، بیشتر نے ماضی کو بھلا کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور خون کے آخری قطرے تک لڑنے کا عہد کیا۔ پیر دھماچوکڑی خطبہ دے کر اور بیعت لے کر اگلی بستی کی طرف روانہ ہو گئے اور بستی کے سرکردہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

میرے ماموں شیر بہادر خان، جو ایک ماہر جنگ جو ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے دانش مند آدمی بھی تھے، کئی دنوں سے ہمارے ہاں ہی مقیم تھے تاکہ لڑائی کی صورت میں ہمارا دفاع کر سکیں۔ وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے، جو پیر دھماچوکڑی کو سخت ناپسند کرتے تھے اور جنھوں نے شام کو پیران دھماچوکڑی کی طرف سے ہونے والی بیعت میں حصہ نہیں لیا تھا۔

جب پیر صاحب بیعت لے کر چلے گئے تو انھوں نے تمھارے دادا کو مشورہ دیا کہ جنگ کا جذبہ

اپنی جگہ،لیکن اتنے بڑے دشمن سے، جوتوپوں اورٹوپے دار بندوقوں جیسے بڑے اسلحے سے لیس ہے، محض جذبات کے سہارے نہیں لڑا جاسکتا۔ اسے پچھاڑنے کے لیے ہمیں حکمت اور تدبیر سے کام لینا ہوگا۔ جنگ کے دوران میں ہمیں بچوں، بوڑھوں اور خواتین کوکسی ایسی جگہ منتقل کرنا ہوگا، جہاں وہ حملے کی صورت میں محفوظ رہ سکیں لیکن مال مویشی اور دیگر ساز و سامان یہیں رہے تاکہ بستی معمول کے مطابق بستی ہوئی نظر آئے اور دشمن کو شک نہ گزرے۔

انھوں نے اس کام کی منصوبہ بندی ؛ایک دولوگوں سے مل کر پہلے ہی کی ہوئی تھی اور دن کو اس گڑھے کا، جوگذشتہ ڈیڑھ ماہ کی خشک سالی کی وجہ سے خشک ہو چکا تھا، معائنہ کر چکے تھے۔

اگلے دن یہاں کئی کمروں پر مشتمل ایک بڑی پناہ گاہ کی تعمیر کا آغاز ہو چکا تھا۔

گڑھے کی تہہ پتھریلی اور ناہموار تھی چوں کہ پتھریلی تہہ کو اتنی جلدی کھود کر برابر کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے تہہ سے دیواریں اٹھا کر ناہموار جگہوں میں مٹی اور پتھر ڈال کر فرش کو ہموار کیا گیا۔ ارد گرد سے کاہو کے درخت کاٹ کر ان کے ستون، کڑیاں اور بالے بنائے گئے اور اوپر چیڑ کے نوک دار پتوں کی تہہ جما کر مٹی ڈال دی گئی۔

اس کے بعد سکھوں کے خلاف ہونے والی تمام لڑائیوں میں بستی کے تمام بوڑھے، بچے اور خواتین یہاں منتقل کر دیے جاتے تھے اور یہاں اس قدیم حویلی کے کھنڈر میں کچھ لوگ تعینات رہتے تاکہ وہ ان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ارد گرد ہونے والی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکیں۔

تمھیں یاد ہوگا کہ جس سال تمھیں مکتب میں داخل کرایا گیا تھا، اسی سال میں نے اس پناہ گاہ کو، جس کی کڑیاں اور بالے کھوکھلے ہو چکے تھے، گرا کر یہاں مہمانوں کے لیے ایک نیا ڈیرا بنوایا۔ ملبے کو ہٹا کر میں نے سرائے صالح سے خصوصی طور پر سنگ تراش بلوائے جنھوں نے کنجور کے پتھروں کو تراش کر فرش ہموار کیا؛ جن جگہوں پر مٹی تھی وہاں زمین کھود کر پتھر نصب کرائے۔ یہ اس پہاڑی علاقے کی واحد عمارت تھی جس کا فرش گارے سے نہیں لیپا گیا تھا اور اس کی چھت پر جانے والے زینے، فرش کی تہہ سے نکلنے والے دیوقامت پتھروں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔

میں جب اس کے فرش پر اور چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر قدم رکھتا ہوں تو معلوم نہیں کیوں مجھے ایک خاص طرح کے تفاخر کا احساس ہوتا ہے۔ جب میں درختوں کے جھنڈ میں گھرے اس قدیم کھنڈر میں قدم رکھتا ہوں تو مجھے اس کی ثابت قدم دیواروں اور سرنگوں ستونوں سے اپنے بزرگوں کی خوشبو آتی ہے اور یہی خوشبو مجھے اس بات پر ایمان لانے پر آمادہ کرتی ہے کہ اسے تعمیر کرنے والے میرے اجداد ہی تھے۔

میں نے تمھارے دادا کا یہ مقبرہ بھی کنجور کے انھی پتھروں سے تعمیر کرایا ہے، اور انھیں یہاں اس پہاڑ کی چوٹی پر انھی کھنڈروں کے قریب دفن کیا ہے، تا کہ انھیں اپنے بزرگوں کی خوشبو آتی رہے حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ انھوں نے کبھی زندگی میں وہ خوشبو محسوس نہیں کی، جس کا میں مدتوں سے اسیر ہوں۔

ایک دفعہ جب میں، معرکہء بالاکوٹ میں ان کی شہادت سے چار پانچ سال پہلے، ان کے ساتھ اس کھنڈر میں آیا اور یہاں سے آنے والی خوشبو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، انھیں بتایا کہ میرا وجدان کہتا ہے کہ ان کھنڈروں کو ہمارے ہی بزرگوں نے آباد کیا ہے اور انھوں نے اس کے پتھر اسی گڑھے سے کھود کر نکالے تھے، جہاں ہم نے بستی والوں کے لیے پناہ گاہ تعمیر کی ہے تو انھوں نے مجھے غصے سے جھٹک دیا تھا' اچھا تو وہ بت جو وہاں رکھے ہوئے ہیں وہ تمھارے بزرگوں نے تراشے تھے؟'

وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے اجداد بت پرست ہو سکتے ہیں؛ وہ تو سمجھتے تھے کہ ہم اس پیغمبر کی اولاد ہیں جس کا نام ذوالقرنین تھا اور اس نے یاجوج وماجوج کو ایک پہاڑی درے میں قید کیا تھا؛ جیسے راجہ رسالو نے ایک دیو کو گندگر کی چوٹی پر بنے پہاڑ میں۔''

بابا نے آخری جملہ ادا کرتے ہوئے، اپنی گردن کو جنوب مغرب کی طرف گھمایا تھا، جہاں گندگر کی چوٹی چمک رہی تھی اور اس سے پار برف سے لدے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں ذوالقرنین کا لفظ منجمد ہو کر رہ گیا تھا کہ ہمارے تفسیر کے استاد نے ہمیں تفسیر ابن کثیر کا درس دیتے ہوئے بتایا تھا کہ بعض مفسرین کا، جن میں ابن جریر طبری جیسے امام المفسرین بھی شامل ہیں، خیال ہے کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر آیا ہے وہ سکندر ہی تھا۔

لواخ

پہلے تو میرے دل میں آیا کہ میں بابا کو وہ سب بتا دوں، جو میں نے اپنے تفسیر کے استاد سے پڑھا اور سنا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا تھا کہ جس طرح ان کے باپ کو اپنے بیٹے کی اس بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ وہ کسی بت پرست کی اولاد ہو سکتے ہیں اسی طرح بابا بھی میری اس بات کا بھی یقین نہیں کریں گے کہ ذولقرنین ہی سکندر ہیں۔ وہ تو پہلے ہی کسی پیغمبر کی اولاد ہونے کے نظریے کو جھٹلا چکے تھے اگر چہ انھوں نے بھی میری طرح اپنے باپ سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

سورج ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جنھیں دیکھتے ہوئے بابا نے کہا۔ ''چلیں۔''

میں نے گردن ہلا کر ہامی بھری۔ بابا نے اٹھتے ہوئے لواخ میں جھانکا، میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ یہ عام گھروں میں استعمال ہونے والے تنور سے زیادہ گہرا تو نہیں تھا لیکن ان سے کئی گناہ چوڑا تھا۔ لواخ کے پتھر سیاہ تھے اور اس کے اندر پڑے ہوئے، کاہو کے ادھ جلے تنے کو دیمک چاٹ چاٹ کر مٹی میں تبدیل کر چکی تھی۔ کاہو کی سخت اور مضبوط لکڑی کا مٹی میں تبدیل ہو جانا، اس بات کی نشانی تھا کہ اسے روشن کیے، کئی برس بیت چکے ہیں۔ اس لواخ پر میں اس کے بعد بھی کئی مرتبہ آیا لیکن بابا کے ساتھ میں یہاں صرف ایک بار ہی دوبارہ آیا تھا؛ ان کے آخری بار محاذ جنگ پر جانے سے کچھ دن پہلے۔

آٹھ

یہ سن ستاون کے موسم گرما کی ایک صبح اور ہفتے کے سات دنوں میں سے کوئی دن تھا۔

دن یاد نہ رکھ پانا ہمیشہ سے میرا مسئلہ رہا ہے، مجھے سارے دن ایک جیسے ہی لگتے ہیں اور دنوں کی یہ تقسیم مجھے مصنوعی لگتی ہے۔ وقت کو صبح، دوپہر، سہ پہر، شام اور رات وغیرہ میں تقسیم کرنے کی تک تو مجھے سمجھ آتی ہے کہ میں اپنے ارد گرد کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اب کون سا پہر چل رہا ہے؛ موسموں کے بارے میں بھی میں محسوس کر کے بتا سکتا ہوں کہ موسم گرمی کا ہے یا سردی کا، لیکن دنوں کو جمعہ، ہفتہ، اتوار وغیرہ میں بانٹنے کی تک آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اگر ایک آدمی ہفتہ، اتوار، پیر، منگل کا پہاڑا یاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو؛ دیکھ، سن یا محسوس کر کے نہیں بتا سکتا کہ آج کون سا دن ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مکتب میں میرا چوتھا سال تھا اور مجھے منطق کا سبق شروع کیے چند ہی مہینے گزرے تھے کہ میں نے یہ سوال اپنے محبوب استاد عنایت اللہ صاحب کے سامنے بھی رکھا تھا، جنھیں منطق کے سارے اصول از بر تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ وہی بات صحیح ہے، جو منطق کے قواعد پر پورا اترے۔ سوال سن کر وہ کچھ دیر ہکا بکا ہو کر میرا منہ تکنے لگے تھے۔ پھر سوال اٹھانے پر مجھے اپنے پاس بلا کر اور میرے شانے تھپتھپا کر شاباش دی تھی: ''خدا نظر بد سے بچائے تم پورے ارسطو ہو۔'' لیکن اس ہلا شیری میں میرا سوال گول کر گئے تھے؛ شاید انھوں نے اس سے پہلے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس سے کچھ ہی دن پہلے ہمارے ڈیرے کی رونقیں پھر سے بحال ہونا شروع ہو گئیں، اور سینہ بہ سینہ یہ باتیں پھیلنے لگیں تھیں کہ چودہ برس بعد ایک بار پھر محاذ جنگ گرم

ہونے والا ہے لیکن یہ باتیں ابھی بڑے بزرگوں کے درمیان گردش کر رہی تھیں؛ عورتوں، بچوں اور حتیٰ کہ مجھ جیسے نوجوانوں تک بھی کسی مصدقہ ذریعے سے نہیں پہنچیں تھیں۔ ہمارے ڈیرے پر اچانک پراسراری سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا تھا؛ وہ جنگجو جو عرصہ ہوا غائب ہو چکے تھے ایک مرتبہ پھر ڈیرے پر آنے لگے، جن میں سے بیشتر کی عمریں چالیس سال سے زائد ہو چکی تھیں اور ان کے سر کے بالوں اور ڈاڑھیوں میں چاندی اترنے لگی تھی مگر ان کے حوصلے اب بھی اٹھارہ بیس سال کے نوجوانوں کی طرح جوان تھے۔ ان میں سے بہت سے خوش دکھائی دے رہے تھے کہ انھیں کئی برسوں کے بعد، ایک مرتبہ پھر دادِ شجاعت دینے کا موقع مل رہا ہے۔

مجھے تجسس تھا لیکن بابا اور دونوں چچاؤں نے مجھ سے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی اور ہمارے ہاں اگر بڑوں کے درمیان کوئی بات چل رہی ہو اور وہ خود نہ بتائیں تو ان سے اس بارے میں پوچھنا بے ادبی سمجھا جاتا تھا؛ سو میں خاموش رہا۔ میں نے باری باری اپنی دونوں ماؤں سے پوچھا تو انھوں نے کہا تمھارے بابا نے ابھی ہمیں کچھ نہیں بتایا لیکن لگتا ہے پھر کوئی جنگ چھڑنے والی ہے۔

❁

انھی دنوں میں سے کسی دن مجھے بڑی ماں نے صبح کی نماز کے لیے جگایا اور ساتھ ہی کہا کہ مسجد سے جلدی آنا، میں ناشتہ تیار کر رہی ہوں، بابا نے تمھیں بلایا ہے۔ سو اس دن میں سورج نکلنے سے پہلے ہی ڈیرے پر پہنچ گیا۔ بابا وہاں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے ساتھ، جن میں سے زیادہ تر ان کے پرانے جنگجو ساتھی تھے، ناشتہ کر رہے تھے۔

ناشتے کے بعد وہ اپنے کچھ جنگجو ساتھیوں کے ساتھ باہر آئے اور ان کے ساتھ مل کر ان ہتھیاروں کا جائزہ لیا؛ جنھیں مقامی لوہاروں نے انھی دنوں تیار کیا تھا۔ ان میں زیادہ تر تلواریں، چاقو اور چھویاں تھیں۔ انھوں نے ایک تلوار اٹھائی، اسے ایک ماہر جنگجو کی طرح ہوا میں، اس طرح لہرایا جیسے وہ امر سنگھ مجیٹھیہ کے روبرو ہوں۔ جب وہ تلوار لہرا رہے تھے، میں نے ان کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال دیکھا؛ جیسے ان کا سارا لہو جسم سے عود کر ان کے چہرے پر آگیا ہو۔ ان کے کانوں کی لویں؛ جن پر

لواخ

وہ سیاہ بال اُگ آئے تھے جنھیں ہمارے خاندان میں بزرگی کی نشان سمجھا جاتا تھا، اچانک سرخ ہوگئیں تھیں۔اس سمے وہ مجھے نوجوانوں سے زیادہ پھرتیلے محسوس ہوئے اوران کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جو میں نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔

تلواروں کو جانچنے کے بعد انھوں نے وہاں پڑی چھویوں میں سے ایک چھوی اٹھائی، جس کا دستہ میرے قد کے برابر تھا؛ یہ چھوی، ان چھویوں سے مختلف تھی، جسے میں نے بکروالوں کے پاس دیکھا تھا۔اس کا پھل خاصا چوڑا تھااور وہ نچلے کونے سے اوپر کو یوں مڑا ہوا تھا جیسے مونچھوں کو تاؤ دے کر اوپر کی طرف موڑ لیا جاتا ہے۔انھوں اسے ہوا میں یوں لہرایا جیسے اس کا وزن جانچ رہے ہوں۔

پھر انھوں نے اپنے ساتھیوں خاص کر منگا خان کو، جس کے ذمے ان ہتھیاروں کی دیکھ بھال تھی، باہر صحن کے ایک کونے میں جا کر کچھ ہدایات دیں، اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

آج ان کے بدن میں، اس دن کی نسبت، جب کچھ عرصہ پہلے میں ان کے ساتھ کھنڈر حویلی دیکھنے گیا تھا کہیں زیادہ پھرتی تھی اور وہ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے، ان کی رفتار میں ایک خاص طرح کا تفاخر تھا۔شاید اس کی وجہ وہ ہتھیار تھے، جو بڑی تعداد میں ڈیرے پر منتقل ہو چکے تھے۔کھنڈر حویلی سے گزرتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو رکے، ایک گہری سانس لی، جیسے بزرگوں کی خوشبو اپنے نتھنوں میں سمیٹ رہے ہوں اور پھر بل کھاتے رستے کا آخری موڑ کاٹ کر، تیزی سے قدم بھرتے ہوئے مقبرے کے احاطے میں داخل ہو گئے اور داخل ہوتے ہی ہاتھ اٹھا لیے۔میں نے بھی ان کے ساتھ فاتحہ کو ہاتھ اٹھائے، انھوں نے دعا مانگ کر اپنے ہاتھ اپنی لمبی ڈاڑھی پر پھیرے اور آگے بڑھ گئے۔

ان کا رخ حسب سابق میدان کے مشرقی سرے پر واقع ٹیلے کی طرف تھا۔میدان عبور کرتے ہوئے میں نے اس وسیع میدان کا جائزہ لیا، جس میں اکا دکا جھاڑیوں کے سوا کوئی بڑا درخت نہیں تھا، کہیں کہیں کٹے ہوئے درختوں کے مڈھ موجود تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے درختوں کو حال ہی میں کسی خاص منصوبے کے تحت کاٹ دیا گیا ہے۔درخت نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سے چاروں طرف میلوں دور پہاڑوں کی چوٹیوں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

لواخ

جب وہ میدان کے آخری سرے پر موجود لواخ کی طرف بڑھنے لگے تو میرے اندر تجسس کی ایک نئی لہر نے انگڑائی لی۔

ٹیلے کی عمودی چٹانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں لکڑیوں کا ٹال دیکھا، جس میں زیادہ تر کاہو اور جنگلی انار کی تھیں؛ پاس ہی ان کی شاخوں کا بھی ایک بڑا سا ڈھیر بنا ہوا تھا، جن کے پتے اگرچہ مرجھائے ہوئے تھے لیکن ابھی مکمل طور پر خشک ہو کر شاخوں سے علاحدہ نہیں ہوئے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں انھی دنوں یہاں لایا گیا ہے، ایک آدھ گٹھڑے کے ساتھ تو گھاس کی رسی بھی موجود تھی جو دور سے یوں نظر آ رہی تھی جیسے بل کھایا ہوا سانپ۔

بابا نے لواخ کا تفصیلی جائزہ لیا، جس کے پتھر حالیہ آنے والے زلزلے میں ایک طرف سے سرک چکے تھے اور اس کی شکل، جو پہلے تنور نما تھی، چولھا نما ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر مشرق کی سمت دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے: سامنے بادلوں کے نیچے اونچی پہاڑی دیکھ رہے ہو، یہ مسیاڑی کی چوٹی ہے، جس سے آگے کشمیر ہے؛ اور وہ نتھیا گلی کی چوٹی ہے۔ پھر ان کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا اور کہا وہ ڈبران ہے، پھر وہ جنوب کی طرف پھرے اور کہا کہ اس چھوٹے پہاڑ کے پیچھے وہ سامنے چوٹی پردناہ ہے اس کے پیچھے پنڈی کا علاقہ ہے۔ میں حیران تھا کہ وہ چوٹیاں جو مجھے بچپن سے ازبر تھیں، بابا مجھے ایک ایک کر کے کیوں گنوا رہے ہیں۔

''ان میں سے کسی بھی پہاڑ کی چوٹی سے اٹھنے والے شعلے پہلے خطرے کی علامت ہوا کرتے تھے لیکن اس مرتبہ خوشی کے شادیانے لے کر آئیں گے۔ ہم دعا کیا کرتے تھے کہ یہاں سے کبھی شعلے نہ اٹھیں لیکن تم دعا کرنا کہ وہاں موجود لواخ جلد سے جلد روشن ہوں۔'' میں ان کی باتیں انہماک سے سن رہا تھا؛ مجھے اس بات کی سمجھ تو تھی کہ وہاں اسے اٹھنے والے شعلوں کا خطرے سے کیا تعلق ہے کہ جنگ ناڑہ شروع ہونے سے پہلے ڈبران کی چوٹی سے جوں ہی شعلے اٹھے تھے، ہم سمجھ گئے تھے کہ حملہ مغربی سمت سے ہوا ہے لیکن ان کا خوشی کے شادیانوں سے تعلق میری سمجھ سے باہر تھا۔

چاروں طرف دیکھنے کے بعد انھوں نے ایک مرتبہ پھر جنوب مشرق کی طرف نظریں اٹھائیں اور

لواخ

کچھ دیر تک وہ مسیاڑی اور نتھیاگلی کی پہاڑیوں کی طرف دیکھتے رہے جیسے وہاں انھیں کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ میں ان چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے؛ ان کے اور کسی ممکنہ خوشی کے درمیان کوئی تعلق تلاش کر رہی رہا تھا کہ وہ لواخ کے پتھریلے تھلے پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میری یادداشت میں یہ لواخ سب سے پہلے راجاؤں کے اس علاقے پر پہلے حملے کے وقت روشن کیا گیا تھا اور آسمان کو چھوتے، اس کے شعلوں نے میلوں دور موجود لوگوں کو خبردار کیا تھا، کچھ ہی دیر میں تمام پہاڑوں کی چوٹیاں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس رات، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔۔۔'' وہ کچھ دیر رکے، گردن گھمائی اور مغرب کی طرف واقع ڈبران کی چوٹی کی طرف مجھے متوجہ کرتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''سب سے پہلے ڈبران کی چوٹی سے آگ کے شعلے بلند ہوئے تھے۔ جہاں سے آگے، اب بھی انھی کی راجدھانی ہے۔

وہ عجیب رات تھی میں ابھی سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ مجھے اذانوں کی آواز نے جگا دیا۔ ایک ساتھ کئی جگہوں سے اذانوں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ پہلے میں سمجھا کہ ابھی عشا کا وقت ہوا ہے اور میں عشا پڑھے بغیر بستر پر دراز ہو گیا ہوں لیکن جب میں نے ذہن پر تھوڑا زور ڈالا تو یاد آیا کہ میں نے عشا کی نماز تو جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھی تھی، جہاں میرے باپ سمیت کئی نمازی، بچوں کو جانے کا اشارہ کر کے بیٹھ گئے تھے۔ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا اگر بالفرض لوگ نماز کے بعد مسجد میں بیٹھتے بھی تو بچوں کو باہر نہیں نکالا جاتا تھا، ہاں اگر وہ شور کرتے تو انھیں گھور کر چپ کرانے کی کوشش ضرور کی جاتی تھی۔ میں اور میرے ہم جولی بڑوں کے اس عمل پر حیران تھے اور ہمارے ذہنوں میں شک ابھرا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو ہم سے چھپائی جا رہی ہے۔ ہم نے باہر نکل کر، دیوار سے کان لگا دیے تا کہ اس بات کا پتہ لگا سکیں کہ بڑوں کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ بہت سی آوازیں ایک ساتھ آ رہی تھیں لیکن یہ آوازیں ہمیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں اور باوجود کوشش کے ہمارے پلے کچھ نہیں پڑا۔ سو ہم مایوس ہو کر اپنے گھروں کو آ گئے۔ میں بستر پر دراز ہوا تو تجسس آمیز وسوسوں نے مجھے گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

لواخ

میں نے اٹھ کر اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے بستروں کی طرف دیکھا وہ دونوں بدستور سوئے ہوئے تھے، اتنے میں اذان کی آوازیں تھم گئیں۔ مجھے لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور اذان کی آوازیں مجھے خواب میں سنائی دے رہی ہیں۔ میں اس خواب کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے باہر آوازوں کا شور دوبارہ سنائی دیا۔ میں اٹھ کر باہر برآمدے میں آیا تھا تو ساری بستی جاگ رہی تھی، بستی کے سارے مرد بستی کے وسط میں موجود میدان میں جمع تھے جب کہ خواتین چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر کھڑی تھیں اور ان سب کا رخ سامنے ڈبران کی طرف تھا، جہاں کی چوٹی پر آگ جل رہی تھی، جو ہماری بستی سے ایک چھوٹی سی مشعل کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔

ہمارے گھر کے آگے موجود میدان سے لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ بستی پر ہونے والے کسی ممکنہ حملے کی بات کر رہے تھے۔

'ڈبران پر حملہ ہو چکا ہے۔'

'ہاں ہوسکتا ہے لیکن ابھی انھوں نے اسے فتح نہیں کیا ورنہ وہ لواخ بجھا دیتے تاکہ باقی بستیوں کو پتہ نہ چل سکے۔'

'میرا خیال ہے ڈبران والے ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔'

'ہمیں لواخ پر نظر رکھنی چاہیے اگر بجھ گیا تو سمجھو، انھوں نے اسے فتح کر لیا۔'

'بھائیو۔ خدا خیر کرے گا۔ ہمارے بندے نہیں پہنچے؟' یہ تمھارے دادا کی آواز تھی۔ جو انھی کے درمیان کہیں کھڑے تھے، لیکن مجھے اندھیرے میں مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ 'بس پہنچنے والے ہوں گے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ان کے ہاتھ میں پکڑی مشعل میدان کے سرے پر دکھائی دی تھی۔' کسی نے کہا، جس کی آواز کو میں پوری طرح نہ پہچان سکا۔

ادھر کچھ مکانوں سے خواتین کے رونے اور چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں اور مرد حضرات انھیں چپ کرانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ایک شخص نے تو باز نہ آنے پر اپنی بیوی کو پیٹنا بھی شروع کر دیا تھا، جس کی وجہ سے میدان میں کھڑے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور انھوں نے اسے

ڈانٹنا شروع کر دیا۔تھوڑی دیر بعد ان میاں بیوی کی آواز دبتی ہوئی محسوس ہوئی، شاید وہ اسے گھسیٹ کر گھر کے اندر لے گیا تھا۔

میں ڈبران کی چوٹی پر روشن لواخ پر نظریں جمائے ؛ یہ آوازیں سن رہا تھا کہ مجھے اپنے پہاڑ کی چوٹی پر سے، شعلے اٹھتے دکھائی دیے، جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہے تھے جیسے ڈھیوں کا ایک بڑا گٹھڑ الواخ میں جھونک دیا گیا ہو۔شعلے دیکھ کر بستی والوں میں اطمینان کی ایک لہر سی دوڑ گئی، جیسے اب وہ پہلے سے زیادہ محفوظ ہو گئے ہوں۔

'شاباش۔دشمن کو پتہ چل چکا ہو گا کہ ہم خبر دار ہو چکے ہیں۔اب وہ حملے کی جلدی نہیں کرے گا۔'سید گل بابا کی آواز سارے میں گونجی، جو خاصے دانش مند آدمی سمجھے جاتے تھے اور بعد میں بالاکوٹ والی جنگ میں تمھارے دادا کے ساتھ شہید ہو گئے تھے۔ان کی آواز سن کر خواتین کا چیخنا چلانا کم ہو گیا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں پہلے دناہ، پھر کوہ مل اور مسیاڑی اور آخر میں نتھیا گلی کی چوٹیاں بھی ان کی ہم نوا بن چکی تھیں۔

میں صحن سے اتر کر میدان کی طرف جانے لگا تو پیچھے سے تمھاری دادی کی سرگوشی سنائی دی، جو ہمارے مکان کی چھت پر کھڑی تھیں۔'خانی۔کہاں جا رہے ہو۔جاؤ اپنے کمرے میں۔''انھوں نے مجھے آہستہ سے پکارا تا کہ ان کی آواز میدان میں کھڑے مردوں تک نہ پہنچے۔میں وہیں رک گیا لیکن ان کے دوبارہ کہنے کے باوجود جب کمرے میں نہیں گیا تو وہ مکان کے پچھواڑے بنے زینے سے اتر کر میرے پاس آ گئیں اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اماں کیا ہماری بستی پر بھی حملہ ہو گا تو انھوں نے کہا یہ باتیں تمھارے سوچنے کی نہیں ؛ اگر حملہ ہوا تو ہمارے مردوں نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں وہ بھی لڑیں گے۔

'میں بھی ان کے ساتھ لڑوں گا۔'یہ سن کر اس کے چہرے پر ایک رونق سی آ گئی۔

'ہاں تم بھی لڑنا لیکن ابھی تم چھوٹے ہو۔ابھی جا کر سو جاؤ کہیں تمھارے بھائی جاگ نہ جائیں۔'

انھوں نے چپکے سے مجھے میرے کمرے میں دھکیلا اور دروازہ بند کر کے آگل چڑھا دی۔

لواخ

میں بستر پر لیٹ تو گیا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

شروع میں، جب میں نے لوگوں کی باتیں سنی تھیں تو مجھے ڈر لگا تھا اسی لیے میں کافی دیر صحن میں دبکا بیٹھا رہا تھا، جہاں سے ڈبران والی پہاڑی پر لواخ دکھائی دے رہا تھا لیکن جب میری ماں نے کہا کہ ہمارے مردوں نے چوڑیاں نہیں پہن رکھیں تو میرے خون میں ایک حرارت سی دوڑنے لگی۔ جب میں نے خود بھی لڑنے کی بات کی اور دیے کی روشنی میں ان کے سرخ و سفید چہرے پر ایک ممتا بھرا جلال دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ لڑنا ہی ایک مرد کی شان ہے۔ اس سمے میرے اندر لڑنے کی شدید خواہش جاگی۔

رات کے پچھلے پہر جب میں نیند کی گہری کھائی میں اترا تو میں نے دیکھا کہ حملہ آور بستی میں داخل ہو چکے ہیں اور بستی کے درمیان موجود لپاڑا میدان جنگ بنا ہوا ہے، میرے ہاتھ میں لشکارے مارتی ایک تلوار ہے اور میں بھی اپنے لوگوں کے ہمراہ دشمن سے لڑ رہا ہوں۔

صبح میری آنکھ کھلی تو بستی کے سارے مرد، دور کسی محاذ پر جا چکے تھے۔ بستی میں صرف عورتیں اور بچے ہی تھے یا پھر وہ مرد جو بوڑھے ہونے کی وجہ سے جنگ آزما نہیں ہو سکتے تھے۔

کئی دنوں تک ہمیں مختلف علاقوں سے متضاد خبریں موصول ہوتی رہیں؛ کبھی خبر آتی ہے کہ مقامی لوگوں نے مل کر راجاؤں کو شکست دے دی ہے اور بستی کی خواتین، بچے اور بوڑھے خوشی کے شادیانے بجانے لگتے اور کبھی افواہ اڑتی کہ انھوں نے ہمارے تمام لوگوں کو مار کر ایک نالے میں پھینک دیا اور بہت جلد ان کی فوجیں مغربی درے سے بستی میں داخل ہونے والی ہیں اور ہم سب اپنے اپنے پیاروں کو رونے لگتے۔ کئی بزرگ، جن کے لیے عام دنوں میں چلنا بھی محال تھا اور وہ مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں جا سکتے تھے، صبح ہوتے ہی بستی کے مغربی درے میں جا کر بیٹھ جاتے اور سارا دن اپنی نظریں آنے والے رستے پر لگائے رکھتے۔ اگر اس طرف سے کوئی مسافر آ رہا ہوتا تو اس سے خبر لینے کی کوشش کرتے۔ لوگ بھی متضاد خبریں دیتے اگر صبح کو وہاں سے گزرنے والا کوئی مسافر مقامی لوگوں کی فتح کی خبر دیتا تو دوپہر کو آنے والا اس کے برعکس۔

ان بے یقینی کے سایوں میں کئی دن گزر گئے۔ خواتین میں طرح طرح کے شکوک و شبہات

جنم لے رہے تھے۔اب انھیں اپنے عزیزوں کی موت سے زیادہ اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر دشمن کی فوج بستی میں داخل ہوگئی تو وہ ان کی عزت؛ان کے بچوں اور بزرگوں کے سامنے تارتار کر دیں گے اور بچوں کو ان کے سامنے نیزوں پر چڑھا دیں گے۔کئی خواتین نے چاقو اور چھریاں تیز کر کے اپنے پاس رکھ لی تھیں تاکہ دشمن کے حملے کی صورت میں وہ اپنی عزت گنوانے سے پہلے اپنے سینے میں چھرا گھونپ سکیں۔تمھاری دادی بھی ان میں شامل تھی۔

ایک دن اس نے مجھے اور میرے بھائیوں کو اپنے پاس بلا کر کہا :اگر بستی پر حملہ ہوگیا تو تم لوگ پہاڑ کی طرف بھاگ جانا۔جب میں نے پوچھا کہ آپ کس طرف کو جائیں گی تو انھوں نے کہا کہ میں کہیں نہیں جاؤں گی،عورتیں گھر سے فرار نہیں ہوتیں؛حملے کی صورت میں ان کی قبریں گھروں ہی میں بنتی ہے۔

یہ سن کر میں اور میرے بھائی رونے لگے۔انھوں نے ہمیں تسلی دی اور کہا: تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔میں نے جب کہا کہ ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے تو انھوں نے مجھے بتیس دھاریں نہ بخشنے کی دھمکی دی۔پھر مجھے میری بات یاد دلائی کہ اس رات تو تم کہہ رہے تھے میں بھی دشمن سے لڑوں گا۔ میں تو سمجھی تھی تم بہادر ہو۔تم تو عورتوں کی طرح بزدل نکلے اور انھی کی طرح رو رہے ہو۔ مجھے دیکھو میں عورت ہو کر بھی نہیں رو رہی۔

میں نے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں واقعی کوئی آنسو نہیں تھا۔رات کو ہم دونوں بھائی انھی کے کمرے میں سوئے۔آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو مجھے ہچکیوں کی آواز سنائی دے۔جب میں نے انھیں آواز دی تو لمحہ بھر کو خاموشی چھائی رہی۔پھر وہ اسی دبنگ لہجے میں بولیں تم ابھی سوئے نہیں۔کلمہ پڑھ کر سو جاؤ،خدا خیر کرے گا۔

اگلی صبح ہم گہری نیند میں تھے اور سورج کا ابھی نام و نشان بھی نہیں تھا کہ ماں نے ہم دونوں کو نیند ہی میں گلے سے لگایا اور زور زور سے روتے ہوئے کہنے لگی۔

’تمھارا باپ زندہ ہے،وہ پہنچنے والا ہے،ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں۔ہم نے انھیں گھیر کے مارا ہے۔ہم نے انھیں ایسا مارا ہے کہ ان کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔‘یہ کہہ کر وہ پھوٹ

پھوٹ کر یوں رونے لگیں، جیسے وہ بیوہ ہو چکی ہوں اور ہم یتیم ۔ ہم بھی اس کے سینے سے لگ کر رونے لگے ۔

فتح کی خبر سن کر رونے کی باتیں تمھیں عجیب لگیں گی ۔تم نے کبھی بے یقینی کے سائے جو نہیں دیکھے ۔

ابھی کچھ دنوں بعد جب تم کسی خبر کے منتظر ہو گے اور تمھاری نگاہیں بار باران چوٹیوں کی طرف اٹھیں گی تو تمھیں سمجھ آئے گی کہ وہ کیسے لمحات ہوتے ہیں، جب دوران جنگ افواہیں گردش کرتی ہیں ۔ جنگ شروع ہوتے ہی، جو چیز سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلتی ہے، وہ افواہیں ہوتی ہیں؛ یہاں تک کہ سچی خبر بھی پہلے کسی افواہ ہی کی صورت پہنچتی ہے، کہ افواہ کی رفتار، برق رفتار گھوڑے سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے ۔"

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کی نظر مسیاڑی کے جنوب میں واقع گلڈنہ کے جنگلات پر جمی ہوئی تھی ، جہاں کے صدیوں پرانے منظر میں، پچھلے کچھ عرصے کے دوران میں، ایک نئی تبدیلی آ گئی تھی ۔ دوپہر کے بعد جوں ہی سورج ڈھلنا شروع ہوتا، گھنے جنگل میں کوئی چیز برف کی طرح چمکتی ہوئے محسوس ہوتی؛ یہ وہاں بنے نئی طرز کے مکانوں کی ڈھلوانی چھتیں تھیں، جب سورج کی ترچھی کرنیں ان سے ٹکراتیں تو ان کی چمک میلوں دور سے نظر آتی ۔

اچانک، آزاد چچا ہمیں تلاش کرتے ہوئے، وہاں پہنچ گئے، انھوں نے بتایا کہ حسن علی خان صاحب آئے ہوئے ہیں اور وہ کافی دیر سے ڈیرے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں ۔

نو

حسن علی خان کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے مانگل کا مکتب یاد آجاتا ہے، جہاں میں نے اپنی زندگی کے سب سے شاندار دن گزارے اور اس کی وجہ حسن علی خان ہی تھے، حالاں کہ اس مکتب سے ان کا کسی قسم کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

اُن دنوں سکھ حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی لیکن اہل مانگل کے دلوں پر اس کی ہیبت ہنوز قائم تھی۔ سکھوں نے اگر چہ اس خطے کی تمام آبادیوں کو تاراج کیا تھا لیکن جس طرح انھوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی اس کی مثال کم کم ہی ملتی ہے۔ مانگل اس دور میں ایک بڑا شہر تھا اور اس علاقے کا تجارتی مرکز بھی۔ کشمیر کی مرکزی شارع پر ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ یہاں سے گزرنے والے قافلوں سے مانگل کی انتظامیہ باقاعدہ راہ داری وصول کرتی تھی، جس کی ادائیگی زیادہ تر جنس ہی کی صورت ادا کی جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ جو چیز پورے خطے میں کہیں دستیاب نہیں ہوتی تھی وہ، وہاں تھڑوں اور ٹھیلوں پر بک رہی ہوتی تھی۔ یوں اس شہر کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی؛ ارد گرد کے علاقوں میں جب کوئی مال و دولت کی شیخی بگھارتا تو ''اڑھائی ٹٹو اور ڈیرا مانگل؛'' کہہ کر اس کا تمسخر اڑایا جاتا تھا۔

خود اہل مانگل کو بھی اپنی دولت وثروت اور طاقت پر ناز تھا لیکن اس شہر کی بدقسمتی تھی کہ ہری سنگھ نلوہ کو، جو ان دنوں کشمیر کا گورنر تھا، والیِ لاہور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے منکیرہ فتح کرنے کے لیے طلب کیا تو اس نے کشمیر سے براستہ مانگل منکیرہ جانے کا فیصلہ کیا، جو باقی راستوں کی نسبت قدرے مختصر تھا۔ جب

اس بات کی خبر اہل مانگل تک پہنچی تو انھوں نے اس کی اطلاع محمد خان ترین کو دی، جو ان دنوں میدان ہزارہ میں سکھوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ہری سنگھ کے پاس بہت سامال و متاع ہے جس میں ریشم، سونے، چاندی اور ہاتھی دانت کی قیمتی اشیا بھی ہیں۔ اس نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ ہری سنگھ کا راستہ روکا۔ ہری سنگھ نے گڑھی حبیب اللہ کے سردار کے ذریعے ترین کو پیغام بجھوایا کہ وہ یہاں سے محض گزرنا چاہتا ہے اور کسی سے تعارض نہیں چاہتا اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس سے تعارض نہ کیا جائے۔ یہ مذاکرات کئی دن تک جاری رہے، محمد خان ترین نے آخری شرط یہ رکھی کہ یہاں سے جو بھی قافلہ گزرتا ہے اس کی راہ داری ادا کرنا ضروری ہوتی ہے، جو مال و متاع ہے، اس کی راہ داری ادا کرو ورنہ ہم تعارض کریں گے۔ ہری سنگھ نلوہ کو سخت غصے آیا اور اس نے بھرپور حملہ کیا اور پورے شہر کو جلا کر نیست و نابود کر دیا۔ محمد خان ترین سمیت باقی لوگ فرار ہو کر گندگر کے پہاڑوں میں قلعہ بند ہو گئے لیکن مقامی علاقے کے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا، جنھوں نے بعد میں سارا الزام محمد خان ترین کے سر تھوپ کر معافی مانگی اور جان خلاصی کی۔ وہاں کے لوگ، جن میں میرے کئی مقامی اساتذہ بھی شامل تھے، ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کانپ جاتے تھے اور جب اس کی کہانیاں وہ طالب علموں کا سناتے تو وہ سہم جاتے تھے۔

ایک دن مولوی عنایت اللہ نے، جو وہاں اعلیٰ درجوں کو منطق پڑھاتے تھے اور جب ہمارے حدیث کے استاد چھٹی پر جاتے تھے تو ہمیں بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے، ہمیں بتایا کہ میں نے بھی جوانی کے دور میں جنگِ مانگل میں حصہ لیا تھا۔ شکست کے بعد جب مجھے گرفتار کر کے ہری سنگھ نلوہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے پُر جلال چہرے کی طرف دیکھتے ہی مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔ سارے لڑکے یہ سن کر سہم گئے۔ میں ذرا بھی نہیں ڈرا، الٹا کھڑے ہو کر انھیں طعنہ دیا؛ آپ بزدل تھے ہمارے سردار نے تو اس کی فوج کو ایسا گھیرا تھا کہ وہ خود تھر تھر کانپتے ہوئے بھاگ گیا تھا۔

مولوی صاحب نے مجھے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کون ہے تمھارا سردار؟''

''حسن علی خان۔'' میرا جواب سنتے ہی مولوی صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ انھوں نے پوچھا کہ تم ان کے کیا لگتے ہو تو میں نے کہا کہ یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن میرے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ میرے پیدا ہونے

کے فوراً بعد انھی نے میرے کان میں اذان دی تھی اور جب میں چھوٹا تھا تو ان کی گود میں کئی دفعہ بیٹھا تھا اور انھوں نے میرے بابا کو ایک گھوڑا بھی انعام کے طور پر دیا تھا؛ وہی گھوڑا، جو پہلی مرتبہ مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ خاصے حیران ہوئے اور انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر، حسن علی خان کے حوالے سے کئی باتیں پوچھیں، جو باتیں میں جانتا تھا انھیں بتائیں اور جو مجھے معلوم نہیں تھیں میں نے کہا کہ میں بابا سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ انھوں نے مجھ سے بابا کا نام پوچھا۔ میں نے انھیں خانی زمان بتایا تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے، جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر کہنے لگے اگر وہ کبھی تم سے ملنے آئیں تو مجھے ضرور بتانا؛ میں ان سے ملوں گا؛ وہ ضرور کوئی بہادر آدمی ہوگا، جسے حسن علی خان جیسے آدمی نے تحفے میں گھوڑا دیا۔

یہ بات، اسی دن پورے مکتب میں پھیل گئی۔ دوسرے اساتذہ کو جب پتہ چلا کہ میں حسن علی خان کے عزیزوں میں سے ہوں تو ان سب نے وقتاً فوقتاً مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھ سے حسن علی خان کے بارے میں تقریباً اسی طرح کے سوال کیے، جیسے منطق والے مولوی صاحب نے کیے تھے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ حسن علی خان کے حوالے سے مانگل میں کئی کہانیاں مشہور ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرح، بیک وقت ایک سے زائد جگہوں پر موجود رہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بعض لوگ، خاص کر چھوٹے بچے انھیں کوئی جن سمجھتے ہیں جس نے ہری سنگھ نلوہ کو کوہِ ناڑہ کی چوٹی پر واقع ایک غار میں اسی طرح بند کر دیا تھا، جس طرح راجا رسالو نے گندگر میں کسی دیو کو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہری سنگھ کو، گوشت پوست کا کوئی انسان شکست دے سکتا ہے؛ وہ ہری سنگھ نلوہ جس نے ان کے شہر کو، جو چاروں طرف سے فصیل بند تھا، راتوں رات تاخت وتاراج کر دیا تھا اور وہاں کے لوگوں نے آبجوئے مانگل میں چھلانگیں مار کر جانیں بچائیں تھیں، جن میں مولوی عنایت بھی شامل تھے۔ ان کے دائیں بازو کی ہتھیلی کے قریب سے ٹوٹی ہڈی، جس کی وجہ سے انھوں نے بائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیا تھا، اسی چھلانگ کی یادگار تھی۔

میرے وہ ہم مکتب، جو رات کو میرے والے کمرے میں سوتے تھے، مجھے بھی کسی جن کی اولاد سمجھنے لگے تھے۔ ان میں سے ایک نے، صبح اٹھتے ہی مجھے خواب سنایا کہ رات کو میں نے دیکھا کہ تم ایک

جن ہواور مجھے مار رہے ہو۔میں نے جھٹ سے کہا، جن ہماری طرح مٹی سے نہیں بنے ہوتے وہ آتش زاد ہوتے ہیں ؛یقین نہیں آتا تو صبح قرآن پڑھانے والے مولوی سے پوچھ لینا۔

درس شروع ہونے سے پہلے، جب اس نے مولوی صاحب کو رات کا خواب سنایا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ حسن علی خان سے مل چکے ہیں ؛اور اُن سے یہ ملاقات، ان دنوں ہوئی تھی جب وہ سید احمد بریلوی سے ملنے کے لیے بالاکوٹ جا رہے تھے اور انھوں نے کنگال بادشاہ کی قبر پر حاضری دینے کے بعد، ان کے تکیے پر قیام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔جب ہمیں اطلاع ملی کہ آج ایک ایسا شخص یہاں قیام کر رہا ہے، جس نے امر سنگھ مجیٹھیہ کو اس کے لاؤ لشکر سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، جس کا بدلہ لینے کے لیے رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوہ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا تھا لیکن ہری سنگھ کی ہمت نہیں بندھی تھی اور اس نے بجیکوٹ میں جا کر ان سے مذکرات کیے تھے تو بے شمار لوگوں کو ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تھا، جن میں، میں بھی شامل تھا۔

جب وہ امر سنگھ مجھیٹھیہ کا ذکر کر رہے تھے، میرا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا اور میرے خون میں فخر و غرور کے جذبات گردش کرنے لگے تھے، ان کی بات ختم ہوتے ہی میں بول اٹھا۔''امر سنگھ میرے بابا کے وار سے زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا تھا۔'' وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ تکنے لگے۔انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں اگر چہ اس وقت چھوٹا تھا لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجھے جھوٹا اور شیخی باز سمجھ رہے ہیں۔''قسم سے میں جھوٹ نہیں بول رہا۔جب میرے چچا مجھے لینے یہاں آئیں گے تو ان سے پوچھ لینا۔انھی نے اسے تلوار ماری تھی۔'' میں نے فوراً صفائی پیش کی۔

انھیں میری قسم پر تو شاید یقین نہ آتا لیکن میں نے انھیں چچا کا بتایا تو انھیں یقین ہو گیا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا کیوں کہ چچا نے بہر حال؛ جلد یا بدیر، میرا اتا پتہ کرنے یہاں آنا تو تھا، اگر وہ ویسے نہ بھی آتے تو آنے والی سردیوں کی چھٹیوں میں، جن میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا، انھوں نے مجھے ہر حال میں گھر لے جانے آنا تھا۔

جب دوسرے اساتذہ کو پتہ چلا کہ میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس نے امر سنگھ ناظم ہزارہ کو قتل کیا

تھا تو انھوں نے میرے ساتھ خصوصی طور پر مشفقانہ برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔ میں جو اس سے پہلے، اس اجنبی ماحول میں سہما سہما سا رہتا تھا اب نڈر ہو گیا اور میرے اندر سے وہ خوف یک دم غائب ہو گیا، جو کسی بھی دس سال کے بچے میں، اپنے ماں باپ اور عزیز و اقارب سے دوری کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے، دن ڈھلتے ہی مجھے بے چینی بھری اداسی گھیر لیتی اور مجھے گھر اور گھر والوں کی یاد ستانا شروع کر دیتی تھی؛ خاص کر عصر کے بعد کا وقت، جو بستی میں ڈھول کی تھاپ پر گتکا کھیلنے کا ہوتا تھا، میرے اندر ایک اداسی بھر دیتا تھا، لیکن اب ہر شام کوئی نہ کوئی استاد مجھے اپنے پاس بلا لیتا اور میرے ساتھ گپ شپ کرتا۔ اکثر اوقات میں رات کا کھانا بھی اپنے ہم مکتبوں کے بجائے انھی اساتذہ کے ساتھ کھاتا۔ جب مکتب کے دوسرے لڑکوں نے میرے ساتھ یہ خصوصی برتاؤ دیکھا تو ان کے دلوں میں حسد سا پیدا ہونے لگا، وہ مجھ سے کھچے کھچے سے رہنے لگے یہاں تک کہ ان لڑکوں نے بھی، جو میرے کمرے میں سوتے تھے اور اب آہستہ آہستہ میرے دوست بن گئے تھے، مجھ سے بات چیت کم کر دی، جس کی وجہ سے میرے اندر چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔

ایک دن، ایک لڑکے نے، جو مانگل ہی کا رہنے والا تھا، مجھے اڑھائی ٹٹوڈیرا مانگل کا طعنہ دیا؛ مجھے اس میں اپنی ہتک محسوس ہوئی اور میں نے اچھل کر اسے دبوچ لیا اور زمین پر گرا کر، گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع کر دی۔ اسی اثنا میں دوسرا لڑکا مجھے مارنے کو دوڑا تو میں نے پہلے والے لڑکے کو ٹانگوں میں دبوچ کر، اُسے بھی کھدیڑ ڈالا۔

اس کے بعد پورے مکتب میں لڑکوں پر میری دھاک بیٹھ گئی، ان لڑکوں پر بھی، جو مجھ سے عمر میں خاصے بڑے تھے اور اعلیٰ درجوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اس دن ہوا جب دو لڑکے جو میرے ہی ہم عمر تھے مل کر ایک لڑکے کو مار رہے تھے، جب میں اسے ان سے چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئے اور بھاگتے ہوئے بار بار مڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں میں ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔

میں مکتب میں عموماً لڑتا نہیں تھا لیکن اگر مجھے کسی بات پر غصہ آجاتا تو یہ دیکھے بغیر کہ مدمقابل

مجھ سے طاقت ور ہے یا کمزور، دھاوا بول دیتا تھا اور زیادہ تر فتح یاب ہی ٹھہرتا تھا، ایک دفعہ تو میں نے ایک جوان لڑکے کو پچھاڑ دیا تھا جو مکتب کے آخری سال میں تھا۔ ایسی ہی کسی لڑائی میں مجھے مولوی عنایت اللہ نے لڑتے دیکھ لیا تھا جو مجھ سے بہت زیادہ شفقت فرمانے لگے تھے۔ انھوں نے مجھے لڑکوں کے سامنے تو خوب ڈانٹا لیکن شام کے وقت اپنے کمرے میں بلا کر مجھے سمجھایا کہ تم ایک بہادر قبیلے کے سپوت ہو اور بہادر اپنی طاقت اس طرح بزدلوں پر ضائع نہیں کرتا وہ اسے میدان جنگ کے لیے بچا کر رکھتا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی اور اس کے بعد میں نے مکتب میں کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی۔

میرا بچپن ایسے ماحول میں گزرا تھا جہاں ہمیں شروع ہی سے لڑنے کی تربیت دی جاتی تھی؛ گتکے کا فن جسے دوسرے مسلمان، سکھوں کا ناچ کہتے تھے، ہمارے قبیلے کا ایک محبوب ناچ تھا۔ جوں ہی ہماری عمر پانچ سال ہوتی تھیں ہم پر دو پابندیاں ضرور عائد کی جاتیں تھی ایک مسجد میں قرآنی قاعدہ پڑھنے کی اور دوسرا عصر کے وقت گتکا کھیلنے کی؛ جس کے لیے لکڑی کی تلواریں اور ڈھالیں ترکھان سے خصوصی طور پر تیار کروائی جاتیں تھیں اور بستی کے کسی ایسے فرد کو، جس نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو، یہ ذمے داری سونپی جاتی تھی کہ وہ عصر کے بعد بستی کے تمام بچوں کو گتکا بازی سکھائے۔ ظہر کی نماز کے بعد ہم قرآنی قاعدہ پڑھنے بیٹھتے تھے اور عصر کی نماز کے فوراً بعد ہماری بستی ڈھول کی تھاپ سے گونج اٹھتی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ بالاکوٹ والی جنگ کے بعد بعض لوگوں نے اسے غیر اسلامی قرار دے کر ڈھول باجوں پر پابندی لگانے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے بستی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی؛ ایک گروہ ان کا طرف دار تھا جو اسے غیر اسلامی سمجھتے تھے اور دوسرے وہ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اس سے ہمارے بچوں میں جنگجویانہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور اسی کی وجہ سے آج تک ہماری بستیوں کو کوئی فتح نہیں کر سکا۔

میرے بابا دوسرے گروہ کے حامی بلکہ پرجوش مبلغ تھے۔ جب اس اختلاف نے شدت اختیار کر لی اور دوسرے گروہ نے زبردستی ڈھول بند کرانے کی کوشش کی تو بابا نے کہا کہ اس کا فیصلہ ہمارے قبیلے کا سردار کرے گا۔ اگلے دن وہ انھیں ساتھ لے کر حسن علی خان کے پاس گئے اور انھوں نے اول الذکر گروہ کو سمجھایا کہ اپنی جان کا دفاع سب سے افضل چیز ہے، جن مولویوں نے تم لوگوں کو اس کے

غیر اسلامی ہونے پر اکسایا ہے ان سے پوچھنا کہ جب حضور نے مدینے ہجرت کی تھی تو ان کا استقبال کیسے کیا گیا تھا۔

پتہ نہیں انھوں نے ان مولویوں سے پوچھا تھا یا نہیں لیکن سنا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شادی بیاہ پر ہونے والے باقی ناچ گانے غیر اسلامی قرار دے کر بند کر دیے گئے اور صرف گتکے کے ساتھ ڈھول بجانے کی اجازت دی گئی۔

دوسرا کھیل ہمارے ہاں کبڈی کا تھا، جسے نسبتاً بڑی عمر کے نوجوان کھیلتے تھے۔ میں نے گاؤں میں کبڈی بہت کم کھیلی تھی؛ ابھی میں اس کے داؤ پیچ سیکھنے کے مرحلے میں تھا کہ مجھے مانگل کے مکتب میں داخل کرا دیا گیا تھا۔

مکتب میں داخلے کے ابتدائی مہینوں میں عصر کے وقت مجھے جس چیز کی شدید خواہش ہوتی تھی، وہ گتکا تھا۔ میں نے ایک دن جھجکتے جھجکتے اپنے ایک ہم مکتب سے، جس کا نام محمد اکبر تھا، پوچھا کہ یہاں گتکا کوئی نہیں کھیلتا تو اس نے حیرانی سے پوچھا یہ کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ صرف ہمارے علاقے میں کھیلا جاتا ہے یا پھر پہلے یہاں بھی کھیلا جاتا ہوگا لیکن جس طرح بالاکوٹ والی جنگ کے بعد ہمارے علاقے میں اسے بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی یہاں بھی کی گئی ہو اور سب نے اسے سکھوں کا کھیل سمجھ کے ترک کر دیا ہو۔ جب میں نے اس سے کبڈی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہاں یہاں کبڈی کھیلی جاتی ہے، جمعے والے دن جب جمعے کے بعد ہمیں چھٹی ہو گی تو میں تمھیں یہ کھیل دکھانے لے جاؤں گا۔

جمعے والے دن جب ہم مرکزی بازار سے گزرنے والی سڑک پر، جس میں ہمارا مکتب تھا، شمال کی جانب آگے گئے تو فرلانگ بھر کے فاصلے پر ایک بڑا سا میدان تھا، جس میں کبڈی کھیلی جا رہی تھی؛ مختلف عمروں کی مختلف ٹولیاں کھیل میں مصروف تھیں۔ پہلے ہم جوانوں والی ٹولی کا کھیل دیکھنے رکے جہاں تماشائیوں کی تعداد زیادہ تھی؛ پھر میں اسے ساتھ لے کر وہاں چلا گیا، جہاں ہمارے ہم عمر کھیل رہے ہیں۔ ایک تماشائی کے طور پر، تھوڑی ہی دیر میں، میں نے اندازہ لگا لیا کہ ایک ٹولی کے کھلاڑی، اناڑی

ہیں اور وہ یہ بازی جلد ہار جائے گی۔ کچھ ہی دیر بعد وہی ہوا۔ جب وہ کھیل نئے سرے سے شروع کرنے لگے تو میں نے ان کے مکھیے سے کہا۔

"میں تمھاری ٹولی کی طرف سے کھیلنا چاہتا ہوں، میں تمھارے سب کھلاڑیوں سے زیادہ اچھا کھلاڑی ہوں۔" اس نے مجھے سر سے پیر تک حیرانی سے دیکھا؛ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اپنی ٹولی کے ایک لڑکے سے کہا کہ تم بیٹھو اسے کھیلنے دو۔ اس نے باری کے لیے سب سے پہلے مجھے ہی دوسری ٹولی کی طرف بھیجا۔ میں ایک لڑکے کو ہاتھ لگا کر بھاگا؛ اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں پکڑائی نہ دیا تو وہ خوشی سے تالی بجانے لگا۔ دوسرا لڑکا گیا تو اسے انھوں نے گرا لیا، اس نے بہت کوشش کی لیکن وہ لکیر تک نہ پہنچ سکا۔ اس نے مجھے دوبارہ بھیجا اور میں نے اب کی بار بھی پھرتی دکھائی اور پکڑنے والے کھلاڑی کو اٹھا کر لکیر کے اس طرف لے آیا۔ دلچسپ مقابلے کے بعد بازی ہمارے ہاتھ رہی۔ ان لڑکوں نے؛ جو بار بار ہار رہے تھے، بازی جیتنے کی خوشی میں مجھے کاندھے پر اٹھا لیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہر روز یہاں آتے ہیں تم بھی آیا کرو اور ہماری طرف سے کھیلا کرو۔ میں نے انھیں بتایا کہ مجھے صرف جمعے کو چھٹی ہوتی ہے اور میں اسی دن آسکتا ہوں۔ انھوں نے کہا ٹھیک ہے اگلے جمعے کو ہم تمھارا انتظار کریں گے۔

واپسی پر اکبر بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہا تھا، اس نے کہا کہ تم تو بہت ماہر کھلاڑی ہو، آئندہ میں بھی تمھارے ساتھ کھیلوں گا۔ واپسی پر جب اکبر نے دوسرے لڑکوں کو جب بتایا کہ میری وجہ سے بار بار ہارنے والی ٹولی جیتی ہے تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم ہر جمعے کو وہاں جانے لگے۔ یہ سلسلہ میرے وہاں سے میری واپسی تک جاری رہا۔

یوں تو سارے ہی اساتذہ مجھ سے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے لیکن مولوی عنایت اللہ، جو منطق اور تاریخ پڑھاتے تھے اور دوسرے استاد انھیں فلسفی کہہ کر چھیڑتے تھے، مجھے بے حد پسند کرتے تھے۔ اگرچہ یہ علوم ابتدائی درجوں کو نہیں پڑھائے جاتے تھے لیکن چوں کہ وہ مجھ پر بہت توجہ دیتے تھے اور مجھے ان کی شخصیت سے انس سا ہو گیا تھا اس لیے مجھے ابتدا ہی سے ان علوم میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور جب وہ اعلیٰ درجوں کو پڑھا رہے ہوتے تو میں بھی جلدی جلدی اپنا سبق سنا کر ان کی جماعت میں شامل ہو جاتا؛ ان

کی باتیں ،غور سے سنتا اور ان سے طرح طرح کے سوال کرتا۔ وہ میرے معصومانہ سوال سن کر بہت خوش ہوتے اور وہ خوشی خوشی اس کے جواب دیتے۔ ہفتے کے دنوں کی تقسیم کے منصوعی ہونے والے سوال پر تو وہ بہت خوش ہوئے تھے، اگر چہ اس سوال کا وہ خود کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے تھے۔

چچا جو پہلی ہی ملاقات میں ان کے دوست بن گئے تھے، اگلی مرتبہ جب مجھے چھٹیوں میں لینے آئے تو انھوں نے اس واقعے کا، ان سے خصوصی طور پر ذکر کیا اور انھیں بتایا کہ آپ کا بھتیجا بہت ذہین ہے اور بڑا ہو کر بہت با کمال عالم بنے گا۔

جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو ان کے وہم گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ جس لڑکے کے مستقبل میں عالم با کمال بننے کی پیشن گوئی کر رہے ہیں وہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ، بغل میں اپنے باپ کا نوشتہ دابے، ایک مفرور کی حیثیت سے گزارے گا اور ان کی منطق اور تاریخ کا علم دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

❁

حسن علی خان، جن کے نام کی وجہ سے میں نے دارالعلوم مانگل میں اساتذہ کی خصوصی توجہ سمیٹی، اگر چہ میرے بابا کے دور پار کے رشتے دار تھے لیکن وہ میرے والد کو اس سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے تھے، جتنا مولوی عنایت اللہ مجھے۔ اس کی وجہ جو مجھے اب سمجھ آتی ہے وہ یہ تھی کہ بابا قبیلے کے ایک پھرتیلے اور جاں باز جنگجو تھے اور وہ ایک جنگجو قبیلے کے سردار؛ جن کی ذہانت، جنگی تدابیر اور قوت فیصلہ نے گذشتہ تیس برسوں میں، ہماری چھوٹی سی ریاست ناقابل تسخیر بنا دیا تھا حالاں کہ ارد گرد کی، اس سے کہیں طاقت ور ریاستوں پر سکھ سلطنت اپنے جھنڈے گاڑھ چکی تھی۔

میری پیدائش کے فوراً بعد جس شخص کی آواز میرے کانوں میں سب سے پہلے گونجی وہ حسن علی خان ہی تھے اور اس خواہش کا اظہار انھوں نے خود کیا تھا۔

بابا کی پہلی شادی قبیلے کی روایت کے مطابق ہمارے حلیف قبیلے کے جنگجو خاندان میں ہوئی تھی۔ بڑی ماں کے والد خود بھی جنگجو تھے اور انھوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت بھی اسی نہج پر کی تھی۔ جب بابا اپنی نوجوانی ہی میں امر سنگھ مجیٹھیہ جیسے سکھوں کے مرد جری کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے میں کامیاب

ہوئے اور وہ راتوں رات ایک عام جنگجو سے، افسانوی کردار میں ڈھل گئے اور ان کی شہرت کے افسانے میدان ہزارہ سے لے کر پکھلی اور امب کی ریاستوں تک پھیل گئے تو انھوں نے حسن علی خان کے والد مہمند علی خان سے، جو حسن علی خان سے پہلے قبیلے کے سردار تھے، اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی بیٹی کی نسبت سید محمد خان کے جری بیٹے سے طے کرنا چاہتے ہیں۔ مہمند علی خان نے میرے دادا سے، اس طریقے سے بات کی کہ ان تک بات پہنچ بھی جائے اور انھیں یہ بھی محسوس نہ ہو کہ پیغام لڑکی والوں کی طرف سے آیا ہے۔ دادا، اس سے اگلے ہی ہفتے بڑی ماں کا ہاتھ مانگنے نانا کے ہاں چلے گئے یوں کچھ ہی دنوں میں بابا کی بڑی ماں کے ساتھ منگنی ہوگئی اور دو سال بعد شادی۔

شادی کے بعد جب تین چار سال تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو دادا نے انھیں دوسری شادی کرنے کا کہا لیکن بابا نہیں مانے۔ بابا کو شادی کے بعد بڑی ماں سے محبت ہوگئی تھی اور وہ اپنی محبوب بیوی پر سوتن نہیں لانا چاہتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اصرار بڑھتا رہا؛ یہاں تک کہ وہ معرکہ بالاکوٹ میں کام آگئے۔ حسن علی خان نے، جن کی سرکردگی میں ہمارے قبیلے نے جنگ بالاکوٹ میں حصہ لیا تھا، بعد میں بابا کو بتایا کہ انھوں نے تمھاری شادی کرانے کی خواہش کا اظہار، اس رات بھی کیا تھا، جس کے اگلے روز ہم نے ہندوستان سے آئے ہوئے مجاہدین کے ساتھ سکھ افواج کا سامنا کرنا تھا۔

''میری بھی خواہش ہے کہ تم جیسے مردِ حر کی نسل پھیلے پھولے تاکہ مستقبل میں وہ قبیلے پر ہونے والے حملوں کا تمھاری طرح دفاع کر سکے۔'' بابا نے اپنے نوشتے میں حسن علی خان کا وہ جملہ درج کر رکھا تھا، جو میری پیدائش کی وجہ تسمیہ بنا۔

دادا کے اس مزار کے وجود میں آنے کے تین سال بعد، چھوٹی ماں بابا کی دوسری بیوی بن کر ان کے گھر منتقل ہوگئیں۔ ان کا تعلق ہرو کے اس پار ٹوپلہ میں بسنے والے ہمارے ہی قبیلے کے ایک خاندان سے تھا۔ چھوٹی ماں کی عمر اس وقت سترہ، اٹھارہ سال تھی اور بابا ان سے عمر میں دگنے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ بیساکھ کی جس رات میری پیدائش ہوئی تھی وہ ہمارے مہمان تھے، آدھی رات کے وقت جب بابا کو اس کی اطلاع ڈیرے پر پہنچائی گئی تو حسن علی خان نے بابا سے کہا کہ مجھے ساتھ

لے کر جاؤ تمھارے بیٹے کے کانوں میں اذان میں خود دوں گا، جس پر میرے بابا خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے ۔ بابا انھیں بستی والے مہمان خانے میں بٹھا کر زنان خانے میں گئے، جہاں مجھے نہلا کر کپڑے پہنائے جا رہے تھے، اور مجھے اٹھا کر حسن علی خان کے پاس لائے اور انھوں نے میرے کانوں میں اذان دی اور دس نانک شاہی سکے، جو انگریزوں سے پہلے ہمارے علاقے میں رائج تھے، میرے بابا کے ہاتھ پر مبارک باد کے طور پر رکھے ۔ جب انھوں نے لینے سے انکار کیا تو حسن علی خان نے انھیں میرے کپڑوں میں زبردستی ٹھونس دیا تھا، جنھیں کبھی خرچ نہیں کیا گیا اور برسوں بعد، بستی اجڑنے کے وقت بھی وہ اس صندوق میں موجود تھے، جس میں بابا کی ذاتی چیزیں رکھی ہوئی تھیں ۔

میری جھنڈ اترائی کی رسم والے دن وہ اپنے گاؤں سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خصوصی طور پر آئے تھے اور اپنے ساتھ ایک بکرا بھی لائے تھے، جسے جھنڈ اترائی کی رسم کے فوراً بعد ذبح کیا تھا اور بستی والوں کی ضیافت کی گئی تھی ۔

''اسی روز مجھے حسن علی خان کی زبانی پتہ چلا تھا کہ جس روز تم پیدا ہوئے اسی رات ہری سنگھ نلوہ، جمرود کی جنگ میں مارا گیا تھا۔'' بابا نے ایک دن مجھے بتایا تھا۔

ہمارے قبیلے کی طرف سے سکھوں کے خلاف ساری جنگیں انھی کی سرکردگی میں لڑی گئیں ۔ سمندر کھٹہ کی جنگ میں شاندار فتح کے بعد ہمارا قبیلہ اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگا تھا اور کسی حد تک کسی ممکنہ حملے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ ادھر سکھ حکومت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہماری ریاست کو زیر نگیں کیے بغیر اس علاقے کی دوسری ریاستوں پر پائیدار حکمرانی کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ رنجیت سنگھ نے اس مقصد کے لیے اپنے ایک قابل سردار، ہری سنگھ نلوہ کو چنا اور اسے کشمیر سے ہٹا کر ہزارہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ ہری سنگھ، سکھوں کا ایک ایسا مردِ جری تھا جس نے رنجیت سنگھ کی حکومت کو پنجاب کے میدانی علاقوں سے نکال کر کشمیر اور افغانستان کی حدود تک پھیلا دیا تھا۔

مانگل کے معرکے، کے بعد اس کے حوصلے بہت بلند تھے ، اس نے میدانِ ہزارہ کی حکومت سنبھالتے ہی تمام علاقوں کے خوانین اور سرداروں کو سرائے صالح کے قلعے میں طلب کیا بیشتر

خوانین اور سردار حاضر ہو گئے؛ کچھ نے پہلوتہی کی جن میں حسن علی خان بھی شامل تھے۔ ہری سنگھ کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ امر سنگھ کا انجام دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے ضبط کیا اور کچھ دنوں بعد سچی کوٹ آیا، جو ہمارے ہی قبیلے کا ایک گاؤں تھا اور اس نے حسن علی خان کو ملنے کا پیغام بھجوایا۔ دونوں کی ملاقات میں طے پایا کہ ایک دوسرے سے تعارض نہیں کریں گے۔ ہری سنگھ کی طرف سے یہ شرط رکھی گئی کہ ہمارے علاقے سے باہر ہونے والی لڑائیوں میں ہمارا قبیلہ غیر جانب دار رہے گا، جسے تسلیم کر لیا گیا۔

چند سال بعد جب سید احمد بریلوی اپنے ساتھیوں سمیت پہلے ستھانہ اور بعد از اں بالاکوٹ مقیم ہوئے اور انھیں پتہ چلا کہ یہاں ایک ایسا قبیلہ بھی ہے جو اب تک سکھوں کے لیے ناقابل تسخیر ہے تو انھوں نے اس کے سردار سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حسن علی خان، قبیلے کے کچھ افراد کے ساتھ، جن میں میرے بابا بھی شامل تھے، انھیں ملنے گئے تو انھوں نے انھیں اپنے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ حسن علی خان نے عذر پیش کیا کہ انھوں نے چوں کہ سکھوں سے معاہدہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنی حدود سے باہر کسی لڑائی میں ان کے خلاف کسی کی معاونت نہیں کریں گے اس لیے ہم مجبور ہیں لیکن مولوی اسماعیل دہلوی نے، جو ان کے سرکردہ ساتھیوں میں سے تھے، طویل بحث مباحثے کے بعد قرآن و سنت سے ثابت کیا کہ کافروں سے اس نوعیت کے ہونے والے معاہدوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں اور یہ کہ ان کے خلاف جہاد فرض ہے اور ہم اسی مقصد کے لیے ہندوستان کے دوسرے کونے سے یہاں آئے ہیں تا کہ یہاں شریعت نافذ کر سکیں؛ آپ کا خطہ خوش نصیب ہے کہ اس کا آغاز یہاں سے ہو گا۔ حسن علی خان نے، جو کسی حد تک ان دلائل سے قائل ہو چکے تھے، انھیں بتایا کہ ہم اکیلے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے ہم یہ معاملہ قبیلے کے سامنے رکھیں گے؛ ہم اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاتے جب تک تمام قبیلہ اس پر متفق نہ ہو۔

جب یہ معاملہ قبیلے کے سامنے رکھا گیا تو اکثریت نے رائے دی کہ ہمیں جہاد میں حصہ لینا چاہیے تا کہ یہاں اسلامی شریعت کو نافذ کیا جا سکے۔ کچھ لوگوں نے، جن میں بابا بھی شامل تھے، اس سے اختلاف کیا۔ بابا کی رائے تھی کہ اول تو مجاہدین کی کامیابی کی امید کم ہے، وہ پشاور کے علاقوں میں ناکام ہو

چکے ہیں؛ دوسرا، ہمارے لوگ جب اس جنگ میں حصہ لیں گے، جو ہمارے علاقے سے میلوں دور لڑی جا رہی ہے تو سکھ افواج ،اس کا فائدہ اٹھا کر یہاں شب خون ماریں گی اور ہمارا علاقہ فتح کرنے کی کوشش کریں گی، جس میں ان کی کامیابی یقینی ہو گی کہ ہمارے بیشتر جنگجو اپنے علاقے سے دور مجاہدین کی جنگ لڑ رہے ہوں گے؛ لیکن جب دادا نے، جو اس وقت جرگے کا حصہ تھے، بابا سے کہا کہ ہم جہاد میں حصہ لیں گے تو انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ باقی لوگ بھی خاموش ہو گئے۔ بابا کے نوشتے کے مطابق:

''اسی شام جہاد کا اعلان کر دیا گیا اور اگلے کچھ ہی دنوں میں دستے بالاکوٹ روانہ ہونے لگے۔ ہزارہ اور کشمیر میں موجود سکھ افواج نے وقتی طور پر اپنی ساری توجہ بالاکوٹ کی جنگ پر مبذول کر لی اور مہینے بھر کے اندر اندر، بھرپور تیاری کر لی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس صبح جنگ کا آغاز ہوا، اسی شام اس کا فیصلہ اُن کے حق میں نکلا؛ سید احمد بریلوی، اپنے بے شمار جانثاروں کے ساتھ شہید ہو گئے، جن میں میرے دادا سمیت بستی کے سات جنگجو بھی شامل تھے۔

ہمارا شکست خوردہ قبیلہ ابھی جنگ بالاکوٹ کے زخم سہلا رہا تھا کہ سکھ افواج نے ہماری ریاست پر دھاوا بول دیا۔ حسب سابق یہ حملہ بھی جنوب مغرب سے کیا گیا تھا۔ سکھوں کو ابتدائی طور پر خاصی کامیابی ملی؛ ہماری سرزمین کا تقریباً چوتھائی حصہ ان کے قبضے میں آ گیا اور انھوں نے اس کی حدود میں دو تھانے قائم کر کے اس میں اپنے سپاہی تعینات کر دیے تھے۔

ہمارے قبیلے نے دو ماہ کے اندر اندر ان کے تھانوں پر دوبارہ دھاوا بولا اور ان کے بہت سے سپاہی قتل کر دیے، جن میں، ان کا ایک تھانے دار بھی شامل تھا؛ تھانوں پر قبضہ کرتے ہی انھوں نے انھیں اپنے قلعوں میں تبدیل کر کے اس میں اپنے جنگجو بٹھا دیے، جس کے بعد ہمارے علاقے میں جنگوں کے بارہ سالہ دور کا آغاز ہوا۔ ہمارا سامنا ایک بہت بڑے دشمن سے تھا، جس کے ملک کی سرحدیں کشمیر سے پشاور تک اور جالندھر سے ملتان تک تھیں، لیکن حسن علی خان کی چھاپہ مار، جنگی حکمت عملی نے انھیں، اس علاقے میں قدم نہیں جمانے دیے۔ حسن علی خان کو معلوم تھا کہ ان دنوں سکھوں کو خطے کی دوسری ریاستوں خاص کر اگرور، امب اور پکھلی میں بھی شورشوں کا سامنا ہے اس لیے وہ

ہمارے علاقے پر کوئی بڑا اور بھرپور حملہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے اور اس مقصد کے لیے فوج کے ایک مخصوص حصے ہی کو مختص کریں گے۔

انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ سکھ افواج کے زیادہ تر سپاہی پنجاب کے میدانی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، اُنھیں دشوار گزار پہاڑی جنگلوں میں جنگیں لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں، جس کا انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے باقاعدہ دوبدو جنگ لڑنے کے بجائے چھاپہ مار کارروائیوں کی حکمت عملی اپنائی؛ جوں ہی سکھ افواج کا کوئی دستہ ان تھانوں کا قبضہ واپس لینے کے لیے حملہ کرتا، تھانہ پہلے ہی خالی کر دیا جاتا، اور وہ اس پر قبضہ کر لیتے۔ کچھ دن خاموشی سے گزر جاتے، پھر کوئی مناسب موقع دیکھ کر، ان پر شب خون مارا جاتا، جو ہتھے چڑھتا قتل کر دیا جاتا، باقی بھاگ کر میدانِ ہزارہ میں پہنچ جاتے۔ حسن علی خان نے حکم دے رکھا تھا کہ راہِ فرار اختیار کرنے والوں کا پیچھا کر کے خود کو تھکانے کے بجائے اگلے حملے کے دفاع کی تیاریاں کی جائیں؛ سو سکھ فوج کا کوئی دستہ اگر گھاس کے تنکے دانتوں میں داب کر اپنی شکست خوردگی کا اعلان کرتا تو اس کے ہتھیار ضبط کر کے اسے فوراً امان دے دی جاتی۔ یہ حکمت عملی خاصی کامیاب رہی اور اس طویل جنگ و جدل میں ہمارا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر ہوا۔

اسی دوران ہری سنگھ، جو ان دنوں پشاور میں تعینات تھا، جمرود کی جنگ میں مارا گیا، جس سے ہزارہ میں تعینات سکھ افواج کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور انھوں نے ادھر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔"

❁

اس سلسلے کی آخری جنگ، جنگ ناڑہ تھی جو میری یاد میں لڑی جانے والی پہلی جنگ تھی۔ اس وقت تک باقی ریاستوں میں شورشیں دم توڑ چکی تھیں اور اس خطے کی تمام ریاستیں مکمل طور پر سکھوں کے قابو میں آ چکیں تھیں۔

یہ جنگ چوں کہ ہماری بستی سے چند میل دور ایک تنگ درے میں لڑی گئی تھی، اس لیے اس کی تمام تر تیاری ہمارے ڈیرے پر بیٹھ کر کی گئی۔ حسن علی خان جنگ کے اختتام تک یہیں قیام پذیر رہے، میرے ذہن میں ان کی جو پہلی یاد محفوظ ہے وہ انھی دنوں کی یادگار ہے، لیکن یہ یاد خاصی مدھم ہے، کہ میری

عمر اُس وقت چھ سال کے لگ بھگ تھی اور ان دنوں سترہ سال سے کم عمر بچوں کا ڈیرے پر جانا منع تھا کہ وہ وہاں رکھے گئے ہتھیاروں سے اپنا کوئی نقصان نہ کر بیٹھیں۔ ہمارے ہاں ان کے طویل ترین قیام کے باوجود، میں ان سے، اس دوران صرف تین مرتبہ مل سکا، جب وہ بابا کے ساتھ ہمارے بستی والے گھر آئے تھے۔

حسن علی خان کو کئی ہفتے پہلے سکھوں کی طرف سے حملے کی بھرپور تیاری کی خبر اپنے پرانے دوست محمد خان ترین کے بیٹے غلام خان ترین کے ذریعے مل چکی تھی، اس نے انھیں یہ بھی بتایا تھا کہ آپ کے روایتی حریف نے انھیں بھرپور مدد کا یقین دلایا ہے اور وہ انھیں اپنے علاقے سے سیکڑوں فوجیوں کا دستہ فراہم کر رہا اور سکھوں کی طرف سے اس دستے کی کمان بھی راجہ خود کرے گا۔

سو اب کی بار حملہ بیک وقت دونوں طرف سے ہوگا۔ سکھ افواج شمال مغرب سے اور راجگان کی فوج جنوب مغرب کی طرف سے حملہ کرے گی۔

حسن علی خان جانتے تھے کہ اب یہ جنگ کسی نئی حکمت عملی کے تحت لڑنا ہوگی ورنہ اتنی بڑی فوج سے ایک آدھ گھنٹا بھی مقابلہ نہیں ہو سکے گا۔ سو کوئی نئی جنگی حکمت عملی بنانے کے لیے انھوں نے ہمارے ڈیرے کو اپنا مستقل ٹھکانہ لیا۔ اسی ڈیرے پر بیٹھ کر انھوں نے نئی جنگی حکمت عملی کے تحت، ہر پہاڑی درے میں، ہمارے ڈیرے کی طرز پر، عارضی پناہ گاہیں بنانے کا حکم جاری کیا، جو اگلے کچھ ہی دنوں میں تیار کر لی گئیں۔

پھر انھوں نے لواخ روشن ہونے کے، صدیوں پرانے مفہوم کو، اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت بدل کر ایک نیا معنی پہنایا۔ اس سے پہلے مخصوص پہاڑی چوٹیوں پر لواخ روشن ہونے کا مطلب، دشمن پر دھاوا بولنے کی تیاری تھا لیکن انھوں نے حکم دیا کہ اب جوں ہی لواخ روشن ہو، جنوبی اور مغربی سمت کی تمام بستیاں خالی کر دی جائیں۔ ان بستیوں کے جنگجو ویں کے پہاڑی دروں میں بنے ڈیروں میں خود کو محصور کر لیں اور باقی لوگ اپنے مال مویشی اور دیگر ساز وسامان لے کر سمندر کھٹہ کے پار موجود بستیوں میں منتقل ہو جائیں اور اس وقت تک واپس نہ آئیں جب تک جنگ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

لواخ

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس شام، میں بستی میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ گتکا کھیلنے اور مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد گھر پہنچ کر کھانا کھا رہا تھا کہ سب سے پہلے کوہ مل کی چوٹی پر لواخ روشن ہوا تھا۔ میں ابھی ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ڈبران کی پہاڑی بھی شعلے اگلنے لگی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد ہماری بستی کے پہاڑ پر بھی لواخ روشن ہو چکا تھا؛ لواخ روشن ہوتے ہی بستی میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ بابا، جو کئی دنوں سے ڈیرے پر ہی مقیم تھے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بستی آئے، وہ بہت سے گھوڑے، خچر اور گدھے ساتھ لائے تھے، جو کئی دنوں سے بستی کے سب سے اوپر والے کھیت میں باندھے ہوئے تھے؛ انھوں نے آتے ہی ضروری ساز و سامان ان پر لادنا شروع کر دیا۔

بستی کے ہر گھر میں یہی صورت حال تھی، کچھ لوگوں نے جن کے پاس بار برداری کے جانور نہیں تھے، اپنا سامان بیلوں پر لادا۔ پہلے ان سارے بار برداروں کو بستی کے میدان میں جمع کیا گیا اور پھر وہاں سے ایک قافلے کی صورت میں سب لوگ اپنے اپنے جانوروں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ چھوٹے بچوں کو سامان کے اوپر بٹھایا گیا، جن میں، میں بھی شامل تھا۔ میرے دونوں شانوں سے ماں کا دوپٹہ پھیر کر نیچے رکھے ہوئے سامان کے ساتھ باندھ دیا گیا تاکہ میں نیچے نہ گروں، مجھے تاکید کی گئی تھی کہ نیند آئے بھی تو سونے کی کوشش نہ کروں۔ بابا نے ہمیں قافلے کے ساتھ رخصت کیا تو میں سہما ہوا تھا، انھوں نے میرا گال تھپتھپایا اور کہا۔ ”ماؤں کو تنگ نہ کرنا؛ میں بہت جلد تم لوگوں کو لینے آؤں گا۔“

قافلے والوں کے ہاتھ میں چیڑ کے تنے کو چیر کر نکالی گئی دلھیوں کی لاٹھیں تھیں، جن کے مخالف سرے شعلہ اگل رہے تھے۔ ایک گھوڑے پر، جو قافلے کے سب سے آخر میں چل رہا تھا، صرف دلھیاں لدی ہوئی تھیں، جوں ہی کسی کی دلھی جل کر ختم ہوتی، وہ رستے کے کنارے کھڑا ہو جاتا اور باقیوں کو گزرنے دیتا؛ جب وہ گھوڑا وہاں پہنچتا تو وہ اس پر لدے گھٹڑے سے دلھیاں نکالتا، انھیں روشن کرتا اور چل پڑتا۔

نصف رات کے قریب، جب ہم سمندر کھٹہ پہنچے، تو نیند نے مجھ پر حملے شروع کر دیے، میں جتنا جاگنے کی کوشش کرتا، نیند اتنی ہی حاوی ہوتی جاتی۔ اتنے میں قافلے کے اگلے سرے سے کسی خاتون

کے دھاڑیں مار کر رونے کی آواز آئی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ ہمارے عزیزوں میں سے کسی کا بچہ نیند میں خچر سے گر گیا اور پیچھے سے آنے والے دوسرے خچر نے اسے کچل دیا، جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔ اس کی ماں پر غشی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے تھے، میری بڑی ماں اور دوسری خواتین نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ قریبی بستی سے چارپائی منگوائی گئی؛ میری بڑی ماں نے دوسری خواتین کے ساتھ مل کر بے ہوش ہونے والی خاتون کو چارپائی پر ڈالا اور بچے کی لاش کو ایک چادر میں لپیٹ کر اس کے پہلو میں رکھ دیا؛ چار لوگوں نے چارپائی اٹھائی اور قافلہ پھر سے رواں دواں ہو گیا۔ اس کے بعد نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہو گئی؛ یہاں تک کہ جب ہم مکول نامی اس بستی پہنچے جہاں ہم نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت مقیم ہونا تھا تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں، لیکن نیند بدستور میری آنکھوں سے غائب تھی۔ جوں ہی میں آنکھیں بند کرتا میرے دماغ میں، اس لڑکے کی شکل گھومنے لگتی، جو مجھ سے تقریباً دو سال چھوٹا تھا اور میں آنکھیں کھول دیتا۔ پھر اس دن کے کسی لمحے، میں نیند کی وادی میں اتر گیا اور سارا دن سوتا رہا تھا۔

وہاں ہمیں نسبتاً ایک بہتر کمرہ دیا گیا، جس میں؛ میں، میری دونوں مائیں اور دادی اماں رہائش پذیر ہوئیں۔ اسی سے ملحق کمرے میں چچی اور ان کے بچے مقیم ہوئے ۔ ہر خاندان نے اپنے مکانوں کے نصف حصے اپنے پاس اور نصف ہماری بستی والوں کو فراہم کیے، لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ بچ گئے جن کے لیے جانوروں کے باڑے خالی کیے گئے اور ان میں صفائی ستھرائی کر کے انھیں چھت فراہم کی گئی۔

جب خالصہ فوج رات کے اندھیرے میں، ہماری ریاست کی مغربی اور جنوبی بستیوں پر حملہ آور ہوئی تو اس کا سامنا ایک خوفناک ویرانی سے ہوا، جس نے ان پر خوف طاری کر دیا۔ ایسی جگہیں جہاں آبادیاں ہوں، وہاں کی ویرانی بہت عجیب ہوتی ہے؛ وہ پیڑ، پودے اور پتھر جو انسانی آوازیں سننے کے عادی ہوں، جب یہ آوازیں وہاں سے کوچ کر جائیں تو وہ خوف سے جھنجھنا اٹھتے ہیں، یہ جھنجھناہٹ وہاں آنے والوں پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ خالصہ افواج نے اس ہیبت کو کم کرنے کے لیے ہماری بستی

کے مکانوں کو آگ لگائی اور ہمارے جنگجوؤں نے ان شعلوں کو ان کے شمشان گھاٹ میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے پہاڑی دروں میں موجود پناہ گاہوں سے نکل کر انھیں اچانک آلیا تھا۔ ریاست کی باقی بستیوں میں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال رہی تھی۔

بابا کے نوشتے کے مطابق: ''راجاؤں کی فوج، جو ساری کی ساری مقامی سپاہیوں پر مشتمل تھی، پہلے تو بے جگری سے لڑتی رہی لیکن جب ان کا سپہ سالار زخمی ہو گیا تو وہ حوصلہ ہار گئے، اب لڑنے کے بجائے اپنے سپہ سالار کو یہاں سے زندہ نکال کر لے جانے میں لگ گئے۔ انھوں نے اسے زخمی حالت میں گھوڑے پر سوار کرایا اور اس کے گرد حصار بنا کر راہِ فرار اختیار کر لی، جسے ایک درے میں گھیر لیا گیا اور ان کے سپہ سالار سمیت انھیں گاجر مولی کی طرح کتر دیا گیا۔

خالصہ افواج نے جب راجا کی فوج کو پسپا ہو کر پیچھے ہٹتے دیکھا تو انھوں نے بھی پسپائی اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی، ہمارے جنگجوؤں نے بگڑہ تک ان کا پیچھا کیا۔ چھ دن تک جاری رہنے والی اس جنگ میں دونوں حملہ آور افواج کا بھاری جانی نقصان ہوا تھا؛ ہمارے بہت کم لوگ اس جنگ میں کام آئے۔''

ساتویں دن جب ہم بستی پہنچے تو ہمارے گھر جل کر خاکستر ہو چکے تھے لیکن ہمارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ چکی تھی اور ہمارے جنگجو، راکھ ہو چکے گھروں کے ملبے پر گتکے کے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار حسن علی خان کو بھی گتکا کھیلتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے میدان میں اترتے ہی بابا کو بھی دعوت دی تھی، وہ بھی ان کے ساتھ محو رقص تھے، جس کی وجہ سے لوگوں کا جوش قابل دید تھا۔ اگرچہ اس وقت ان دونوں کی جوانی ڈھل چکی تھی لیکن رقص کے اس سمے وہ بیس پچیس سال کے کھلنڈرے جوان لگ رہے تھے۔

ویسے بھی میری یادداشت میں ان کا جو چہرہ محفوظ ہے وہ اس چہرے سے بالکل مختلف ہے، جو ان لوگوں کے ذہن میں ہے جنھوں نے ان کی سالاری میں جنگیں لڑی ہیں۔ بابا نے اپنے نوشتے میں، ان کا جو ناک نقشہ کھینچا اور جو رعب و دبدبہ بیان کیا تھا وہ اس حسن علی خان سے میل نہیں کھاتا، جو میرے

ذہن میں نقش ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اُنھیں ایک زیرک اور طاقت ور سپہ سالار کے طور پر دیکھا اور میں نے بابا کے ایک عزیز دوست کے طور پر۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں، جو میرے بابا کے ساتھ جنگیں لڑتے رہے اور انھیں دشمن کو پچھاڑتا دیکھتے رہے، بابا کا بھی کوئی ایسا ہی نقشہ ہو لیکن میرے ذہن میں بابا کی جو تصویر محفوظ ہے وہ ایک جنگجو سے زیادہ ایک مشفق باپ اور بیک وقت دو بیویوں کے ساتھ محبت کرنے والے شوہر کی ہے؛ یہ الگ بات ہے میری چھوٹی ماں کا خیال تھا کہ وہ میری بڑی ماں کو زیادہ چاہتے ہیں۔

دس

بابا،حسن علی خان سے عمر میں چند سال چھوٹے تھے، تاہم دونوں کا قد بت تقریباً برابر ہی تھا۔ وہ لباس بھی کم وبیش ایک جیسا ہی پہنتے تھے لیکن جو چیز حسن علی خان کو بابا سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کی پگڑی تھی، جو بابا سمیت قبیلے کے تمام افراد کی پگڑیوں سے مختلف تھی؛ یہی ان کی سرداری کی نشانی تھی۔ ان کی پگڑی کا شملہ ہمیشہ اونچا ہوتا تھا اور اسے چاولوں کے پانی میں بھگویا جاتا تھا تا کہ وہ اکڑی رہے اور اس کا شملہ چلتی ہوا میں بھی بلند رہے۔ عملی زندگی کی طرح، دونوں میرے دماغ میں بھی ہمیشہ لازم وملزوم رہے، میں جب ایک کے بارے میں سوچتا ہوں تو دوسرا خود بخود میرے ذہن میں عود کر آتا ہے؛ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حسن علی خان کا ہمیشہ وہ چہرہ میری آنکھوں میں ابھرتا ہے، جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا اور بابا کا وہ چہرہ، جب میں نے انھیں آخری مرتبہ دیکھا۔

یہ سن ستاون کے بھادوں کی بارھویں شام تھی۔ حبس، جس نے گذشتہ ایک ڈیڑھ ماہ سے گھنے جنگلوں میں گھری ہماری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اب آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا تھا۔ ہوا، جو پچھلے کچھ روز سے اپنا خرام بھول چکی تھی، اس کی پرانی یادداشت لوٹ آئی تھی اور اب وہ درختوں کے پتوں میں سر سرانے لگی تھی۔ دن ڈھلے کی دھوپ اب بھی بدن کو چبھتی تھی لیکن سائے ایک خوش گوار موسم کی خبر دیتے تھے کہ ہوا میں ہلکی سی خنکی در آئی تھی۔ حملے کی تیاری، جو گذشتہ اڑھائی تین ماہ سے دن رات جاری تھی، مکمل ہو چکی تھی۔ بستی کے بیشتر جنگجو گذشتہ چند راتوں میں تین چار چار کی ٹولیوں میں تا کہ کسی کو خبر نہ ہو، بستی سے محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ بابا نے روانگی سے پہلے مجھے بلایا، میں ان کے کمرے میں داخل

ہوا تو وہ اخروٹ کی لکڑی کے بنے صندوق میں، جو میری بڑی اماں اپنے جہیز میں لائی تھیں، کچھ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ انھیں اس طرح صندوق میں جھکے ہوئے دیکھا تھا۔ عام طور پر جو چیز انھیں درکار ہوتی تھی، منگا خان یا عبدل چچا انھیں پیش کر دیتے تھے۔ شاید انھوں نے میرے قدموں کی آہٹ سن لی تھی، وہ اچانک میری طرف مڑے تو ان کے ہاتھ میں ایک پرانی ٹوپی اور لٹھے کی ایک چادر تھی، جو اگرچہ صاف ستھری تھی لیکن اس کا رنگ، اس کی بوسیدگی کا پتہ دے رہا تھا۔ وہ میری طرف بڑھے اور انھوں نے ٹوپی میرے سر پر رکھ کر اس بوسیدہ چادر کو میرے سر پر پگڑی کی صورت باندھ دیا۔

پھر وہ کمرے کے درمیان واقع ستون سے لٹکی ہوئی اس تلوار کی طرف بڑھے، جسے میری یادداشت نے ہمیشہ یہیں پایا تھا اور جب بھی میرے ذہن میں ان کے کمرے کے اس ستون کا تصور ابھرتا، اس کے ساتھ لٹکی ہوئی یہ تلوار موجود ہوتی۔ بہت پہلے، جنگ ناڑہ میں جب ہمارے ڈیرے پر سنگ فساں نصب کیا گیا تھا تو دوسرے ہتھیاروں کے ساتھ اسے بھی سان پر چڑھایا گیا تھا۔ میری یادداشت میں کوئی دوسرا ایسا لمحہ محفوظ نہیں جب میں نے اسے ستون سے علاحدہ دیکھا ہو۔ بابا نے تلوار اتاری، قبضے سے پکڑ کر اسے چمڑے کی میان سے باہر نکالا، اس کی دھار پر ایک نظر ڈالی، پھر اسے واپس میان میں رکھ کر میری گردن میں حمائل کر دیا۔

''یہ وہ تلوار ہے، جس کے وار سے امر سنگھ کو پہلا زخم لگا تھا اور یہ وہی پگڑی ہے، جو میں نے اس سمے پہنی ہوئی تھی اس نے اس مشکل وقت میں میری لاج رکھی تھی اور سر سے گری نہیں تھی۔ میں اس وقت جس گھوڑے پر سوار تھا وہ جب مرا تو میں نے اس کا چمڑا اتروا کر اسی سے یہ میان تیار کروائی تھی۔ میں نے اس کے بعد نہ تو کسی معرکے میں یہ تلوار استعمال میں لائی اور نہ ہی کسی محاذ پر یہ پگڑی پہنی۔ حسن علی خان نے بارہا اصرار بھی کیا کہ یہ پگڑی اور تلوار دونوں تمھارے لیے مبارک ثابت ہوئیں اس لیے ان کے ساتھ میدان جنگ میں جانا اچھا شگون ہوگا، لیکن میں سمجھتا تھا کہ جس تلوار کا وار کر کے، میں نے دشمن کے ایک جری سپہ سالار کو گھوڑے سے گرایا، اس سے کسی عام سپاہی کا سر قلم کرنا اس تلوار کی توہین ہے اور وہ پگڑی جس نے پہلے

ہی معرکے میں میری لاج رکھی، جس میں ہمارے قبیلے کے، اس وقت کے نامی گرامی جنگجو داد شجاعت دے رہے تھے، اگر کسی موقع پر میرے سر سے گر گئی تو یہ برا شگون ہوگا اور شاید میں اس موقعے پر حوصلہ ہار بیٹھوں، سو میں نے اسے تمھارے لیے سنبھال لیا تھا؛ ان دونوں کی لاج رکھنا۔

میں چند دن پہلے تمھارے دونوں چچاؤں اور بستی کے چند معززین کو ساتھ لے کر حسن علی خان کے پاس گیا تھا کہ ان کے مشورے سے آزاد خان کو اس بستی کا سردار مقرر کروں۔ جب میں نے ان کے سامنے آزاد خان کا نام لیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے آزاد خان نے تمھارا نام لے لیا۔ میں نے اعتراض کیا کہ وہ ابھی کم عمر ہے تو آزاد خان نے کہا کہ اب سکھوں اور راجاؤں کا دور لد چکا؛ اب ہمارا سامنا انگریز سے ہے، جس کا چھوٹے سے چھوٹا سالار بھی پڑھا لکھا ہے، سو ہماری بستی کا سردار بھی پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ حسن علی خان نے نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ آزاد خان کو اس کی فراست کی داد بھی دی؛ سو آج سے اس بستی کے سردار تم ہو؛ محاذ جنگ سے واپسی پر، فتح کی خوشی میں ہم حسن علی خان کو یہاں بلوا کر اس کا باقاعدہ اعلان کریں گے۔

ہم نے منصوبے کے تحت بھادوں کی اٹھارویں رات مری پر دھاوا بولنا ہے اگر اس دن حالات سازگار نہ ہوئے تو اس سے اگلے روز۔ پہلے ہمارا مقابلہ سکھوں سے تھا اب انگریزوں سے ہے؛ دشمن بدلا ہے تو ہم نے لواخ کے معنی بھی بدل دیے ہیں اور تمام بستیوں کے سرداروں کو اس کی اطلاع کر دی گئی ہے۔ اب اگر مسیاڑی، نتھیا گلی یا دناہ کی چوٹیوں سے شعلے اٹھیں تو سمجھنا یہ ہماری فتح کا اعلان ہے۔ بیٹے! میری خواہش ہے کہ اب ہماری فتح کی خبر تمھارے ذریعے بستی والوں کو پہنچے۔ تم نے ان پہاڑوں پر نظر رکھنی ہے، جوں ہی تمھیں ان میں سے کسی کی چوٹی پر لواخ دکھائی دے، اپنا لواخ تم نے اپنے ہاتھوں سے روشن کرنا ہے۔'' ان کے لب و لہجے میں ایک خاص طرح کا طمطراق اور چہرے پر جلال تھا۔

کچھ دیر خاموشی ہمارے درمیاں حائل رہی، خاموشی کے اس وقفے میں، میں نے محسوس کیا کہ ان کے پُر جلال چہرے پر آہستہ آہستہ فکر مندی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں، وہ کسی گہری سوچ

میں غرق تھے ۔اچانک وہ دوبارہ اسی صندوق کی جانب بڑھے؛ اب کی بار وہ واپس پلٹے تو ان کے ہاتھ ،غلاف میں لپٹی کتاب تھی، مجھے لگا کہ وہ قرآن پاک ہے اور وہ اس پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے کوئی عہد لینا چاہتے ہیں،لیکن جب انھوں نے اس پر سے غلاف اتارا تو یہ وہی نوشتہ تھا، جسے میں عمر گل صاحب کے ہاں سے لے کر آیا تھا۔

''ہم نے اگر چہ اپنی طرف سے پوری تیاری کی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اس بار بھی سرخرو لوٹیں گےلیکن جب آدمی محاذ جنگ پر ہوتا ہےتو موت اس کے لیے بالکل ایک بےمعنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے؛ میں نے ہر جنگ اپنی زندگی کی آخری جنگ سمجھ کےلڑی ہے ۔

محاذ جنگ پر بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی کو لگتا ہے کہ یہاں مرنا بھی اتنا ہی بےمعنی ہے جتنا کسی کو مارنا۔ایسے لمحے میری زندگی میں بارہا آئے ہیں ۔میں جب اس وقت یہاں تمھارے سامنے کھڑا، ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں لیکن اس سمے موت سے ذرا بھی نہیں ڈرا۔موت تو بہر حال آنی ہے،میری خواہش ہے کہ میں جب بھی مروں کسی محاذ پر ہی مروں اور جس زخم سے میری موت واقع ہو،وہ میرے سینے پر کسی تمغے کی طرح سجا ہوا ہو،اور زمین پر میری پیٹھ اس وقت لگے، جب میرا جسم ٹھنڈا ہو چکا ہو۔

ہوسکتا ہے میری یہ خواہش اسی معرکے میں برآئے؛اس صورت میں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا کہ یہی ایک جنگجو کے بیٹے کے شانِ شایان ہے ۔بچپن میں میری خواہش تھی کہ میں علم حاصل کروں، میں زیادہ نہ پڑھ سکا، میں نے اپنی وہ خواہش تمھیں پڑھا لکھا کر پوری کی ہے،لیکن میں تمھاری جنگجویانہ تربیت اس طرح نہیں کر سکا جس طرح ایک جنگجو کو کرنی چاہیے تھی ۔میں نے اس نوشتے میں ۔۔۔'' انھوں نے ہاتھ میں پکڑا نوشتہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔''اپنے کچھ جنگی تجربات لکھ دیے ہیں؛ اور باپ دادا میں سے ان لوگوں کے حالات بھی ، جو میں نے بزرگوں سے سنے؛انھیں اپنی اولاد تک پہنچانا تا کہ وہ جان سکیں کہ ان کی رگوں میں کن لوگوں کا خون دوڑ رہا ہے ۔میں نے تمھارا رشتہ تمھاری سوتیلی ماں کے خاندان میں طے کر دیا ہے میں اگر لوٹ آیا تو تمھارے سر پر سرداری کی پگڑی رکھنے کے ساتھ

ساتھ ،اپنے ہاتھوں سے سہرا بھی سجاؤں گا۔وہاں سے میری لاش آنے کی صورت میں بھی،تم نے شادی اسی خاندان میں کرنی ہے تاکہ میرے پوتوں میں دونوں جنگجو قبیلوں کی خصوصیات شامل ہوں اور وہ ہماری ریاست کی بہتر طور پر حفاظت کرسکیں۔

اور ہاں حسن علی خان کے ہم پر اور ہماری بستی پر ہی نہیں پورے قبیلے پر احسانات ہیں۔کوئی بھی بڑا فیصلہ، چاہے وہ خاندان کے معاملے ہی میں کیوں نہ ہوان کے مشورے کے بغیر نہیں کرنا۔اگر ان کے کسی فیصلے سے اختلاف بھی ہوتو ان کے سامنے کبھی سر اکڑا کر نہ چلنا۔پرسوں رات قبیلے نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس حملے میں براہ راست شریک نہیں ہوں گے کہ وہ پہلے ہی سے حکام کی نظروں میں ہیں، ناکامی کی صورت میں انھیں فوری طور پر گرفتار کیا جاسکتا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا وہ سردار، جس کی وجہ سے آج ہم متحد ہیں، سزا کا موجب ٹھہرے اور اس کی عدم موجودگی میں ہم بکھر جائیں۔

تمھاری ،دادی ، ماؤں اور چچیوں کی ذمے داری گھر داری تک ہے خاندان اور بستی کے باقی معاملات تم نے خود سنبھالنے ہیں؛ جہاں مشکل آئے حسن علی خان کے پاس حاضر ہونا اور ان کے مشورے پر عمل کرنا؛ وہ تمھیں ہمیشہ صائب مشورہ دیں گے۔''

بابا نے، جو دوران گفتگو سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے ،ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی؛ لمحہ بھر کے لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، جیسے ان میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں، پھر اپنی نئی دستار سر پر رکھی، دو چاقو نیفے میں اڑسے، تلوار گردن میں حمائل کی؛ مجھے سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور دروازے سے نکل کر بستی کی طرف روانہ ہو گئے؛ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھے زنان خانے کی طرف بڑھے اور اپنی ماں کے قدم چھوئے ، میری دونوں ماؤں نے بابا کے قدم چھوئے؛ ان سب کو الوداع کہا اور گھر کی سیڑھیاں اتر کر میدان میں آگئے جہاں بستی کے سارے بوڑھے اور بچے انھیں الوداع کرنے کے لیے جمع تھے۔

بابا تمام بزرگوں سے باری باری جھپی ڈال کر ملے، بچوں سے ہاتھ ملایا۔گھوڑے کی زین کسی جا چکی تھی ،ان کے تین ساتھیوں اورنگزیب خان، داؤد خان اور منگا خان نے انھیں گھوڑے پر سوار ہونے

میں مدد دی کہ میرے دونوں چچا،اس سے ایک رات قبل ہی بستی کے درجن بھر جنگجوؤں کے ساتھ، محاذ جنگ کے پہلے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو چکے تھے تاکہ وہ وہاں پہنچ کر ضروری منصوبہ بندی کر سکیں۔

گھوڑے پر سوار ہو کر بابا نے پیچھے مڑ کر ڈوبتے سورج پر ایک نظر ڈالی، سب کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی؛ ان کے ساتھیوں کے گھوڑے بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔ جوں ہی ہجوم نے انھیں رستہ دیا، ان کی رفتار میں تیزی آئی تو میں نے دیکھا کہ ان سب کے اگلے دائیں قدم، پچھلے بائیں قدموں کے ساتھ اور اگلے بائیں قدم، پچھلے دائیں قدموں کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بستی کے بزرگوں نے جب مجھے بابا کی تلوار گردن میں حمائل کیے اور سر پر ان کی بوسیدہ سی پگڑی باندھے دیکھا تو مجھے مبارک باد دینے لگے؛ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی بستی کا نیا سردار چنا جا چکا ہے۔

گیارہ

بابا کی روانگی کے ٹھیک آٹھویں دن بھادوں کی بیسویں سہ پہر، جب بستی میں یہ خبر ایک افواہ کی صورت پہنچی کہ حملہ ناکام ہوگیا ہے؛ ہمارے بہت سے جاں باز مارے جا چکے ہیں، کچھ کو سرکار نے گرفتار لیا ہے اور باقی جان بچا کر جنگلوں میں چھپ گئے ہیں تو کسی کو اس پر یقین نہ آیا؛ یقین نہ کرنے والوں میں، میں خود بھی شامل تھا۔ مجھے ذاتی طور پر اگرچہ جنگ لڑنے کا عملی طور پر کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن میں نے ایک جنگجو قبیلے میں آنکھ کھولی تھی جو کم از کم تین پشتوں سے متواتر جنگیں لڑتا آیا تھا۔

گذشتہ رات، میں نے بستی کے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ، اسی کوہ ناڑہ کی چوٹی پر موجود میدان میں جاگ کر گزاری تھی اور ہماری نظریں بار بار دناہ، مسیاڑی اور نتھیا گلی کی چوٹیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں، اس لواخ کو دیکھنے، جس کا روشن ہونا اب اس بات کی علامت تھی کہ ہمارا حملہ، جس کی تیاری میں ہم نے گزشتہ تین ماہ گزارے تھے، کاری ثابت ہوا اور فتح ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ ان چوٹیوں پر سوکھی لکڑیوں خاص کر چیڑ کی ڈھیلیوں کا انتظام دس دن پہلے ہی کیا جا چکا تھا اور دناہ اور مسیاڑی کے مقام پر تو لواخ کے اوپر ایک بلند چھپر ابھی ڈال دیا گیا تھا تا کہ بارش کی صورت میں بھی اسے روشن کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہاں کچھ لوگ تعینات کر دیے گئے تھے، جنھوں نے وہاں آگ کے انگارے راکھ میں دبا رکھے تھے تا کہ جوں ہی حملے کی خبر وہاں پہنچے لمحہ بھر میں لواخ روشن کر کے فتح کی خبر میلوں دور موجود بستیوں تک فوراً پہنچائی جا سکے۔ ہماری بستی سمیت کئی بستیوں میں ڈھول باجوں کا بھی بندوبست کیا گیا تھا تا کہ جیسے ہی کسی پہاڑی پر لواخ روشن ہو فتح کے شادیانے بجائے جا سکیں۔ لڑکوں نے ہماری حویلی

کے سامنے والے میدان میں گتکابازی کی تیاری کر رکھی تھی اور اس کے لیے لکڑی کی تلواروں اور ڈھالوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہ لوگ جو گتکا کھیلنا نہیں جانتے تھے اور سمی مار کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتے تھے، انھوں نے ہاتھوں کی انگلیوں میں باندھنے کے لیے گھنگھروؤں کا بندوبست پہلے سے کر لیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سکھوں کے ساتھ ہونے والی آخری جنگ موسوم بہ جنگِ ناڑہ میں جوں ہی سکھ افواج نے پسپائی اختیار کر کے فرار کی راہ اختیار کی تھی، تمام لوگوں نے گتکابازی کے فن کا مظاہرہ کیا تھا، جس میں میرے بابا اور حسن علی خان نے بھی گتکا کھیلا تھا۔

اس بار ہم نے طے کیا تھا کہ ہم؛ فاتح جنگجوؤں کے بستی میں داخل ہونے کا انتظار نہیں کریں گے؛ جوں ہی لواخ روشن ہوگا ہم سارے جشن منانے میدان میں نکل آئیں گے۔ چوں کہ بابا کی خواہش تھی کہ لواخ، میں اپنے ہاتھوں سے روشن کروں، سو میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں رات یہیں گزاری تھی۔

لیکن جب پو پھٹنے لگی تو ہماری خوشیاں مدھم پڑنا شروع ہو گئیں۔ پھر جب نتھیا گلی اور موج پوری کی چوٹیوں کے درمیان سے سورج نے جھانکنا شروع کیا تو مجھ سمیت سب لوگ یہ سوچ کر پہاڑ سے اتر کر اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے کہ کسی وجہ سے حملہ کل رات تک کے لیے موخر کر دیا گیا ہوگا؛ ہمارے خیال میں ہماری فتح اتنی یقینی تھی کہ شکست کا لفظ تک ہم میں سے کسی کے ذہن میں نہیں ابھرا تھا۔

ہم سب کا خیال تھا کہ اس سے پہلے ہم نے مقامی راجاؤں اور سکھوں کے خلاف جتنی بھی جنگیں لڑیں پہل انھی کی طرف سے ہوئی تھی۔ ہم نے آج تک اپنی طرف سے کوئی جنگ نہیں چھیڑی؛ جب ہمیں کسی طرف سے حملے کی خبر ملتی تو ہم اپنے دفاع کی تیاری شروع کرتے جب کہ حملہ آور کئی کئی مہینے پہلے حملے کی منصوبہ بندی کرتے لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں کسی بھی جنگ میں شکست نہیں دے سکے سوائے ہری سنگھ کے، جس کا حساب بعد میں برابر کر دیا گیا تھا۔

مری پر حملہ اس کے برعکس تھا؛ یہاں ہم اپنا دفاع نہیں کر رہے تھے، بڑھ کر حملہ کرنے گئے تھے۔ یہ وہ پہلی جنگ تھی، جس کی ہمارے بڑوں نے پوری منصوبہ بندی کی تھی اور ہر پہلو سے اس کا جائزہ لے کر اس کی تیاری شروع کی تھی۔ یہ واحد جنگ تھی جس میں ہم نے دشمن کو چاروں طرف سے گھیر کر مارنا

تھا؛اس سے پہلے تو دشمن ہمیں گھیر تا تھا اور ہم اس کا گھیرا توڑ کر اس پر حملہ آور ہوتے تھے۔

اس دن جب یہ خبر مختلف بستیوں سے گردش کرتی ہوئی ،ظہر کے وقت گاؤں پہنچی تو میری سگی ماں سمیت ،بستی کی خواتین نے اپنے دوپٹے سروں پر باندھ کر ،بین کرنا شروع کر دیے اور دوہتھڑوں سے اپنے سینے پیٹنے لگیں ۔صرف میری سوتیلی اماں ان میں شامل نہیں تھیں ،جن کے شوہر کی سربراہی میں یہ دستہ روانہ ہوا تھا؛ وہ الٹا میری سگی ماں کو تسلیاں دے رہی تھیں ۔جب میں چھوٹی ماں کو تسلی دینے ان کی جانب بڑھا تو وہ مجھے سینے سے لگا کر بین کرنے لگیں ۔

بڑی ماں نے مجھے سینے سے لگا کر صرف ایک ٹھنڈی آہ بھری، دلاسا دیا اور پھر آنسو پونچھ لیے حالاں کہ ان کے تو اپنے خاندان کے کئی لوگ ، جن میں میرے ماموں فتح خان اور سمندر خان بھی شامل تھے،اپنے گاؤں کے جنگجوؤں کے ساتھ جنگ میں شریک تھے اور جانے سے ایک دن پہلے وہ خصوصی طور پر ہمارے گھر آئے تھے؛اپنی بڑی بہن سے ملنے،اور بڑی ماں نے انھیں رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا: میرے سر کے تاج کا خیال رکھنا۔انھوں نے اپنی بہن کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا کہ بھائی تک کوئی تلوار ہماری گردن اڑا کر ہی پہنچ سکے گی۔

میری دادی کو، جو اس وقت خاصی بوڑھی ہو چکیں تھیں اور اونچا سنتی تھیں، جب میری بڑی ماں نے، جو ان کی دور پار کی رشتے دار بھی تھیں، آ کر بتایا کہ جنگ میں ہمیں شکست ہو گئی ہے تو انھوں نے انتہائی اونچی آواز میں، جیسا کہ بہرے لوگوں کا وطیرہ ہوتا ہے، کہا تھا۔

''نہیں یہ جھوٹ ہے؛ ایسا نہیں ہو سکتا۔میرے بیٹے نے تو مجیٹھیے جیسے سورما کو مار دیا تھا۔اس کی لاش دوسرے دن سمندر کھٹے جا کر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔'' اونچی آواز میں بولتے ہوئے انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ والی دونوں انگلیاں اپنی آنکھوں کی طرف، جن کی بینائی عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی، یوں لے کر گئیں کہ مجھے لگا جیسے وہ ان سے اپنی آنکھیں پھوڑ دیں گی۔

''یہ چٹی چمڑی والے مجیٹھیے اور نلوے سے تو تگڑے نہیں ہیں، میرے بیٹے نے تو نلوے کو بھی ناک رگڑوا کر چھوڑا تھا، جس نے میدان ہزارہ میں وہ انت مچائی تھی کہ آج بھی وہاں کی عورتیں، اپنے بچوں کو اس کا

نام لے کر ڈراتی ہیں؛ یہ موئے مچھ منے انگریج تو شکل ہی سے مجھے ڈرپوک لگتے ہیں۔ ایک دفعہ جب وہ میرے بیٹے سے ملنے آئے تھے تو میں نے انھیں غور سے دیکھا۔"

میں نے اس وقت، چھوٹی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے انھیں بھی دادی کی بات پر کسی حد تک یقین آ گیا ہے۔ انھوں نے بین روک دیے، تاہم ان کے خاموش آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر میری بھی کچھ ڈھارس بندھی۔

میں نے فوراً دو لوگ کالاباغ روانہ کیے، جو ایبٹ آباد سے مری جانے والے مرکزی راستے پر ہے۔ مرکزی شارع پر ہونے کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کو مری میں ہونے والے واقعات کی خبر پہنچنا یقینی تھا۔ انھیں روانہ کر کے میں خود کچھ لوگوں کو لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا کہ میں اپنی ماؤں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا، وہ جب میری طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں نمی سی آ جاتی۔

رات کے پچھلے پہر جب وہ لوگ ڈیرے پہنچے تو میں چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ میں نے انھیں روانہ کرتے ہوئے تاکید کی تھی کہ خبر اچھی ہو یا بری سب سے پہلے مجھی تک پہنچانا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو میں، دِلھیوں کی روشنی میں ان کے چہروں پر نظر ڈالتے ہی، سمجھ گیا کہ حملے کی ناکامی کی خبر سچی ہے۔ ان میں سے ایک، جس پر بابا بہت اعتماد کرتے تھے، میرے سینے سے لگ کر رونے لگ گیا۔ میں بھی یہ خبر سن کر جذباتی ہوا اور میری گھگھی سی بندھ گئی لیکن مجھے فوراً بابا کی تاکید یاد آ گئی کہ اگر میں مر گیا تو رونا، دھونا نہیں جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کرنا؛ سو میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ جا کر دوسرے کمرے میں آرام کرو اور سرِ دست اس بات کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہیے؛ خاص کر میرے خاندان میں سے کسی کو بھی اس کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔

وہ چلے گئے تو میں اپنے کمرے کے ستون کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگا، جہاں اب بھی وہی تلوار لٹکی ہوئی تھی، جو بابا نے روانگی والے دن میری گردن میں حمائل کی تھی۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ میں فوراً گھر جاؤں اور اپنی دونوں ماؤں کو سینے سے لگا کر دھاڑیں مار کر روؤں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔

میں کافی دیر تک ستون کو جپھا مارے کھڑا رہا۔ میرے اندر ایک جوش نے انگڑائی لی اور مجھے

لگا جیسے خون میری رگیں توڑنے لگا ہے، میں نے ستون کے ساتھ لٹکی تلوار اتاری اور اسے ہوا میں یوں لہرانے لگا، جیسے میرے بابا کبھی نئی تلوار کو جانچنے کے لیے لہراتے تھے، ایسا کرتے ہوئے میں نے خود کو، مری کی چوٹی پر بنی، نئی طرز کی عمارتوں کے درمیان، دشمنوں میں گھرا ہوا محسوس کیا اور اگلے لمحے بابا پر حملہ کرنے والے فوجیوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ مجھے لگا کہ میں تن تنہا ہی پوری گورا فوج کے لیے کافی ہوں، لیکن یہ خوش فہمی فوراً ہی رفع ہو گئی اور مجھے عجیب سی بے چینی نے آن گھیرا۔ میرے دل میں عجیب سے وسوسے سر اٹھانے لگے کہ اگر بابا اور اس کے ساتھی گرفتار ہو گئے اور انھوں نے انھیں پھانسی پر چڑھا دیا تو بستی والوں کا کیا بنے گا۔

مجھے پیش آمدہ حالات کا پوری طرح تو اندازہ نہیں تھا کہ حملے کی ناکامی کی صورت میں ہمیں کس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ویسے بھی ایک ایسا شخص جس کی بہ مشکل ابھی ڈاڑھی مونچھیں آئی ہوں اور اس نے اپنی شعوری زندگی کا زیادہ حصہ اپنی بستی سے دور ایک مکتب میں گزارا ہو، وہ پیش آنے والی صورت حال کا اندازہ کر بھی کیسے سکتا تھا۔ سر پر برسوں پہلے کے ایک فاتح کی پگڑی باندھ لینے اور ہاتھ میں دشمن کے سپہ سالار کا خون بہانے والی تلوار تھام لینے سے، جس سے بہتر تلواریں اب بستی کے عام جنگجوؤں کی دسترس میں تھیں؛ اور آنسوؤں کو ضبط کر لینے سے آدمی خاندان اور برادری کا بوجھ اٹھانے کے قابل تو نہیں ہو جاتا۔ بستی کی سرداری کے لیے بابا اور قبیلے کی سرداری کے لیے حسن علی خان جیسا جگرا چاہیے ہوتا ہے، جو اُس وقت میرے پاس نہیں تھا اور اب تو خیر بالکل بھی نہیں۔

میں کافی دیر مختلف وسوسوں اور واہموں میں گھرا سوچتا رہا۔

باوجود اس کے کہ حملے کی ناکامی کی تصدیق ہو چکی تھی اور اس بات کی بھی کہ بیشتر حملہ آور گرفتار ہو چکے ہیں، میرے اندر ایک موہوم سے امید جاگی کہ ہو سکتا ہے؛ حملے کی ناکامی کی خبر جھوٹی ہو اور یہ خبر انگریز فوج کے ان سپاہیوں نے پھیلائی ہو، جو وہاں سے جان بچا کر بھاگے ہوں۔ پھر اس حسن ظن نے بھی میرے دماغ پر دستک دی، جو گذشتہ صبح سورج طلوع ہوتے وقت، پوری بستی کے ذہن میں تھا کہ ہو سکتا ہے؛ ابتدائی حملہ پسپا ہونے پر ہمارے جانباز پیچھے ہٹ گئے ہوں اور دن نکل آنے کے خدشے کے پیش

نظر وہ آس پاس کے جنگلوں میں چھپ گئے ہوں تا کہ رات کو ایک بار پھر بھر پور حملہ کر سکیں۔ ممکن ہے آج شام انھوں نے دو بارہ حملہ کیا ہو اور دشمن کو تہس نہس کر دیا ہو اور اس کی خبر پہنچنے ہی والی ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں فوراً میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں کھنڈر حویلی کے قریب پہنچا تو مجھے وہم سا ہوا کہ دناہ کی چوٹی پر لواخ روشن ہو چکا ہے؛ لیکن جب میں میدان میں داخل ہوا اور چاروں طرف نظر دوڑائی تو میرا دل پھر سے اداس ہو گیا۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا ہر چوٹی کو اس امید پر دیکھتا رہا کہ شاید ابھی کوئی شعلہ ہوا میں بلند ہو اور میری امیدیں پھر سے روشن ہو جائیں؛ یہاں تک کہ مجھے اپنی بستی کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی اور میری آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ میں اٹھا اور ڈیرے کی طرف چل دیا؛ میری پلکیں نیند سے بوجھل تھیں، میں بستر پر دراز ہوتے ہی نیند کی وادی میں اتر گیا۔

❁

میں نیند کی گہری کھائی میں تھا کہ مجھے ایک عزیز نے آ کر جگایا اور کہا کہ ابھی ابھی آزاد خان اور عبدل خان گاؤں پہنچے ہیں، حملہ واقعی ناکام ہو چکا ہے۔ میں فوراً بستی کی طرف بھاگا۔ ہر طرف صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

بارہ

''جب ہم خار دار تاریں کاٹ کر چھاؤنی میں داخل ہوئے تو ہر سو ویرانی تھی۔''میرے چچا آزاد خان نے، مجھے بتایا تھا۔''ویرانی دیکھ کر ہم خوش ہوئے کہ ہمارا دشمن بے خبر ہے اور ہم اسی بے خبری میں اسے جالیں گے اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیں گے۔

باڑیاں کے مقام پر ہی ہمارے مسلح افراد کو لالا نے تین مختصر دستوں میں تقسیم کر دیا تھا اور تینوں کے الگ الگ سالار مقرر کر دیے گئے تھے اور ہم تینوں بھائی الگ الگ دستوں میں تھے۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ پہلا حملہ وہ دستہ کرے گا، جس کی سالاری لالا نے اپنے پاس رکھی تھی، پھر صورت حال دیکھ کر باقی دونوں دستے آگے بڑھیں گے۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد ہم نے باڑیاں سے کوچ شروع کر دیا، تینوں دستے الگ الگ رستوں سے روانہ ہوئے۔ میں اس دستے میں شامل تھا، جس کی سربراہی مکول کے محمود خان کر رہے تھے اور فقیر خان اس دستے میں جس کے سالار ستوڑہ کے گل نواز خان تھے۔ ہر دستے کے ساتھ کچھ ایسے مقامی لوگ تھے، جو ان راستوں سے واقف تھے اور ان کے پاس درانتیاں اور آریاں تھیں، جن سے انھوں نے چھاؤنی کی حدود میں موجود جنگل میں رستہ بنانا تھا۔

جب ہمارا جتھا چھاؤنی کی حدود میں پہنچا تو لالا کا جتھا تاریں کاٹ کر اندر جانے کا رستہ بنا چکا تھا اور لالا سمیت بیشتر لوگ چھاؤنی کی حدود کے اندر واقع گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے، میں چوں کہ مختلف جنگوں میں لالا کے ساتھ رہا تھا اور ہمیشہ اس جتھے میں شامل رہا تھا، جو ان کی سربراہی میں لڑتا، پہلی مرتبہ مجھے کسی دوسرے دستے میں شامل کیا گیا تھا، اس لیے میں اپنے جتھے سے علاحدہ ہو کر سیدھا لالا کے پاس

گیااور ان سے اس خواہش اظہار کیا کہ مجھے اپنے جتھے میں آنے کی اجازت دیں، میں ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں جو سب سے پہلے حملہ کریں گے۔'ٹھیک ہے،ٹھیک ہے،محمود کو بتا آؤ۔'لالا نے، جو اس وقت جلدی میں تھے، جواب دیا۔ میں واپس بھاگتا ہوا، اپنے جتھے کے سالار محمود خان کے پاس گیا، جنھوں نے اپنے جتھے کے ہمراہ خار دار تاروں سے باہر، اس وقت تک رکنا تھا جب تک پہلا جتھا حملہ کر کے ردعمل کا جائزہ نہیں لے لیتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ لالا نے مجھے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور کہا ہے کہ اس کی اطلاع آپ کو دے دوں۔ میں ان کا جواب سنے بغیر ہی واپس بھاگا اور کچھ ہی دیر میں اس دستے کو جا لیا، جو اندھیرے اور گھنی جھاڑیوں میں رستہ بناتا ہوا آگے کو بڑھ رہا تھا۔ ان کے آگے مقامی لوگ تھے جو اس سارے جنگل سے واقف تھے اور وہ اپنی درانتیوں اور آریوں سے جھاڑیاں کاٹ کر ایک طرف کو پھینک رہے تھے تاکہ ہمارے بعد آنے والے مسلح جتھوں کے لیے بھی راستہ بن سکے۔

ہم نے بمشکل ایک فرلانگ کا رستہ طے کیا ہوگا کہ ہمیں چھاؤنی کی روشنیوں میں عمارتوں کے ہیولے نظر آنا شروع ہو گئے تھے، جن کی چھتیں ہماری ہموار چھتوں کے برعکس اونٹ کی پیٹھ اور کوہانوں کی طرح ڈھلوانی تھیں اور جن پر سے برف خود بخود پھسل کر نیچے گر جاتی ہے اور انھیں برف ہٹانے کے لیے ہماری طرح بیلچوں اور پھاؤڑوں کا استعمال نہیں کرنا پڑتا۔

وہاں کچھ دیر ٹھہر کر ہم نے صورت حال کا جائزہ لیا؛ بیشتر عمارتیں دو لمبی قطاروں میں آمنے سامنے کے رخوں پر تھیں اور ان کے درمیان ایک کھلا میدان تھا؛ جس میں لگے کھمبوں سے جلتی ہوئی مشعلیں لٹک رہی تھیں جن کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میدان کے جنوبی سرے پر پہاڑ کی ڈھلوان پر بھی کچھ عمارتوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے، جو مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں اور ان کے صحن میں کچھ ہیولے گردش کر رہے تھے، جس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ افسروں کی رہائش گاہیں ہیں۔

عمارتوں کے چاروں طرف پہرے دار چوکس کھڑے تھے، جن میں سے کچھ کے ہاتھ میں بندوقیں اور کچھ کے ہاتھ میں تلواریں تھیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ لالا نے تین چار لوگوں کو، جن

میں، میں بھی شامل تھا، آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا کہا اور باقی لوگوں کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔
انھوں نے سرگوشی کے انداز میں ہمیں ہدایت دی کہ قدم زمین پر جما کر چلنا تا کہ آہٹ سنائی نہ دے اور نہ ہی کوئی پتھر لڑھکے۔ ہم آہستہ آہستہ اس آخری چٹان تک پہنچ گئے، جہاں سے آگے میدان شروع ہوتا تھا۔ انھوں نے ہمیں چٹان کی اوٹ میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور خود چٹان کے ایک طرف سے جھانک کر چھاؤنی کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ ہمیں وہیں بیٹھے رہنے اور سپاہیوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کا کہہ کر، خود واپس جتھے کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا تو ہمارا جتھا چٹان کے پاس پہنچ چکا تھا۔
لالا نے ہمیں خاموش رہ کر انتظار کرنے کا کہا۔

❁

'یلغار ہو'۔
عشا کی اذانوں کی آواز بلند ہوتے ہی، لالا کی زوردار آواز گونجی اور ہم سب آناً فاناً میدان میں کود پڑے۔ ہم چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ میدان کے جنوبی کنارے پر بندوقیں داغنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تھوڑے بدکے لیکن ہم نے دیکھا کہ بندوق کی آواز سنتے ہی وہاں موجود تمام سپاہی عمارتوں کے دروازوں کی طرف بھاگے گئے، جس سے ہمارے حوصلے بلند ہو گئے اور ہم زیادہ تیزی کے ساتھ، ان کی طرف بھاگنے لگے۔ سپاہیوں نے اپنے آپ کو کمروں کے اندر مقفل کرلیا۔ جوں ہی ہمارا جتھا میدان کے وسط میں پہنچا ہمیں کان پھاڑ دینے والی ایک آواز سنائی دی اور میدان میں بارود کے شعلے برسنے لگے۔ ان کی اٹھارہ پنی توپوں کے دھانے کھل چکے تھے ہمارے ساتھیوں کے جسم ہوا میں اڑنے لگے، ہر سو افرتفری سی پھیل گئی اور لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ تلواروں سے لڑنے والے بندوقوں اور توپوں کا سامنا کب تک کر سکتے تھے۔
اسی افراتفری میں، میں لالا کے پاس پہنچ گیا اور ان کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر کھڑا ہو گیا کہ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ ان کی موت کا سبب بننے والا کوئی زخم ان کی پیٹھ پر نہ لگے۔

''مجھے لگتا ہے کسی نے حملے کی مخبری کر دی ہے۔''لالا نے، میری طرف مڑے بغیر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ پھر مجھے حکم دیا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں نے انکار کیا تو وہ مجھے دھکیل کر ایک چٹان کی اوٹ میں لے آئے۔

'آزاد۔ میں نے بہت جنگیں لڑی ہیں۔لیکن یہ جنگ اور نوعیت کی لگ رہی ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ مخبری بہت پہلے ہو چکی تھی اور وہ ہماری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔انھوں نے توپیں پہلے سے تیار کر رکھی تھیں۔ مجھے موت کی چاپ سنائی دے رہی ہے لیکن میں پیٹھ دکھا کر اپنے کارناموں پر پانی نہیں پھیرنا چاہتا۔میری خواہش ہے کہ میرا ایک ماں جایا زندہ رہے اور میرے بعد میرے بیٹے کو جنگ کی تربیت دے تاکہ وہ ان سے لڑ سکے؛ میری یہ خواہش پوری کرو اور عبدل کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے چچا کی گھگھی سی بندھ گئی۔لیکن انھوں نے ضبط سے کام لیا اور مجھے بھی یہ کہہ کر تسلی دی کہ''خدا خیر کرے گا۔''

تیرہ

اگلے دن دو پہر کے وقت خبر آئی کہ ہمارے لوگوں نے پلٹ کر دشمن پر کاری وار کیا؛ اس کے بہت سے سپاہی مارے گئے ہیں اور باقیوں نے بھاگ کر اپنے آپ کو ایک بلند و بالا عمارت میں قلعہ بند کر لیا ہے۔ ہمارے جنگجوؤں نے زمین کھود کر ان نلکوں کو کاٹ دیا ہے، جس کے ذریعے چھ میل دور واقع موج پوری کی چوٹی سے، چھاؤنی تک پانی پہنچایا گیا تھا اور اب ہمارے جنگجو اس بلند و بالا عمارت کو سر کرنے کے لیے بھبڑ اور سوتری کے مضبوط رسوں کی تلاش میں چھانگلہ گلی آئے ہوئے ہیں تاکہ ان کی دیواروں پر کمندیں ڈال کر اندر داخل ہوں۔ یہ خبر سنتے ہی بستی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، لوگ بستی کے میدان میں جمع ہو گئے تاکہ گتکا بازی کر کے یا سمی اور رلڈی ڈال کر اس فتح کا جشن منائیں، میں خوشی کی یہ خبر سن کر جذباتی ہو گیا اور میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے، لیکن چچا نے ہمیں منع کر دیا اور کہا کہ جب تک خبر کی تصدیق نہیں ہوتی، اس وقت تک کوئی آدمی خوشی کا اظہار نہ کرے۔ بستی والے چچا کے کہنے پر باز تو آ گئے لیکن ان کے چہروں پر شادمانی رقصاں تھی، جو اس وقت تک جاری رہی جب اس سے اگلے دن دوسری خبر، جو اس کے برعکس تھی، نہیں آ گئی۔

اگلے دن ایک جندروئی کے ذریعے یہ خبر بستی تک پہنچی، جس کا جندر سمندر کھٹہ کی آبشار چھتنار کے قریب عین اسی جگہ واقع تھا، جہاں برسوں پہلے امر سنگھ کو قتل کیا گیا تھا۔ جندروئی نے بستی میں آ کر چچا کو بتایا کہ مکول بالا کے ایک شخص نے، جو اناج پسوانے دو پہر کے وقت جندر پر آیا تھا، مجھے بتایا ہے کہ انگریزوں نے مسیاڑی، ملوٹ اور ارد گرد کے جنگلوں میں چھپے ان افراد کو، جنھوں نے دو دن پہلے ان

کی چھاؤنی پر حملہ کیا تھا اور بعد ازاں وہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے، گرفتار کر لیا ہے ۔جن میں آپ کے دونوں بھائی خانی زمان خان اور فقیر خان بھی شامل ہیں ۔خانی زمان خان کو گرفتار کرنے کے لیے جب جنگل میں چھاپہ مارا گیا تو انھوں نے مزاحمت کی اور ان کے دو سپاہیوں کو زخمی کر دیا لیکن دوسرے سپاہیوں نے ان کے دائیں ہاتھ پر بندوق داغی جس کی وجہ سے وہ زخمی ہو گئے اور انھیں فوراً گرفتار کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی ۔

یہ خبر سن کر ساری بستی جو تھوڑی دیر پہلے تک شادیانے بجانے کی تیاری کر رہی تھی، ماتم کدے میں بدل گئی ۔ چچا نے سب لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور کہا حوصلہ رکھیں ،جس طرح کل والی خبر آج جھوٹی ثابت ہوئی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ خبر بھی جھوٹی ہو؛ سو جب تک کسی خبر کی تصدیق نہیں ہو جاتی کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کریں اور اپنی عورتوں کو بھی سمجھائیں ،ان کے رونے دھونے سے بستی کے بچوں پر برا، اثر پڑتا ہے اور ان میں بزدلی کے جذبات ابھرتے ہیں ۔

لیکن لوگوں کے جذبات پر بند باندھنا وعظ و نصیحت سے کہاں ممکن تھا۔افواہیں، جیسا کہ میرے باپ نے کہا تھا، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تیز رفتاری سے گردش کرتی ہیں ۔کئی دن تک بستی متضاد افواہوں کی لپیٹ میں رہی؛ صبح کوئی خبر لوگوں کے چہروں پر شادمانی بکھیرتی تو شام کو اس کے برعکس آنے والی کوئی دوسری خبر رنج والم کے آثار طاری کر دیتی؛ اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک یہ خبر نہیں آ گئی کہ کل صبح مری پر حملہ کرنے والے بائیس افراد کو ،جن میں باز خان کے آٹھ بیٹے اور میرے بابا بھی شامل ہیں ،گلڈنہ کی چوٹی پر واقع میدان میں طلوع آفتاب کے وقت توپوں سے اڑایا جائے گا۔ باقی لوگوں کو جن میں میرے چھوٹے چچا فقیر خان بھی شامل ہیں انھیں پنڈی کی جیل میں بھیج دیا گیا ہے جہاں ان پر مقدمہ چلا کر مزید کارروائی عمل میں لائی جائے گی ۔ یہ خبر چوں کہ گل محمد خان ،میرے اور چچا کے پاس لایا تھا، جو حسن علی خان کا خاص آدمی تھا اور جس نے چچا کے ساتھ کئی جنگوں میں حصہ لیا تھا ،اس لیے اس کے جھوٹے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

جوں ہی گل محمد خان ڈیرے سے روانہ ہوا، چچا میرے سینے سے لگ کر رو پڑے؛ میرے ضبط

کا بند بھی ٹوٹ گیا اور ہم دیر تک روتے رہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ کل صبح تک، جب تک، وہ شہید نہیں ہو جاتے یہ بات کسی کو نہیں بتانی، اپنی ماؤں کو بھی نہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر رو پڑے۔

میری عمر اس وقت بیس سال ہو چکی تھی اور میں نے جتنا وقت چچا کے ساتھ گزارا تھا، بابا کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کا مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ یہ وہی چچا تھے، جن کے ساتھ میں نے سب سے زیادہ سفر کیے تھے، مکتب کے آخری چند برسوں کو چھوڑ کر، جب میں اپنے طور پر مانگل جانے کے قابل ہو گیا تھا، ہمیشہ چچا ہی مجھے لانے اور لے جانے کی ذمے داری نبھاتے رہے؛ وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔

اگر میں نے انھیں، ہنسی مذاق اور ٹھٹھا مخول کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا تو انھیں کبھی روتے ہوئے بھی نہیں پایا تھا۔ جب ان کا جوان بیٹا، جو عمر میں مجھ سے دو سال بڑا تھا، مرا اور پورا گاؤں اس کے جنازے پر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا تب بھی میں نے ان کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہیں دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ بڑی ماں نے بابا کو بلا کر کہا تھا کہ آزاد کو رلانے کی کوشش کرو۔ اتنے بڑے دکھ کو ضبط کرنا خطرناک ہے اس کا جگر پھٹ سکتا ہے، میں جو دارا بھائی کی لاش دیکھ کر، چپکے سے آنسو بہا رہا تھا، بابا نے مجھے بلا کر کہا تھا کہ جاؤ اور چچا کے گلے لگو۔ بابا کا خیال تھا کہ اس طرح انھیں اپنے جوان بھتیجے میں اپنے بیٹے کی تصویر نظر آئے گی تو وہ رو پڑیں گے۔ میں جب دھاڑیں مار کر، ان کے سینے سے لپٹا تو انھوں نے الٹا مجھے تسلیاں دینا شروع کر دیں اور کہا بیٹا حوصلہ رکھو، مرد رویا نہیں کرتے۔

لیکن اگلے روز، جب بابا کو اپنے اکیس ساتھیوں کے ساتھ توپوں سے اڑایا جا چکا، میں نے اسی شخص، یعنی اپنے چچا کو، عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر روتے دیکھا تو حیرت سے پتھرا گیا۔

میں نے گزشتہ رات، اس خوف سے ڈیرے پر ہی گزاری تھی کہ کہیں ماؤں کا سامنا کرتے ہوئے میں رونہ پڑوں اور انھیں پتہ چل جائے کہ بابا کو صبح توپ سے اڑایا جائے گا۔ میں ڈیرے پر بابا والے کمرے میں انھی کے بستر پر لیٹا ساری رات روتا رہا تھا، اس اذیت کو یاد کر کے، جس سے وہ اس وقت مری کی چوٹی پر موجود کسی عمارت کے کمرے میں گزر رہے تھے۔ صبح منہ اندھیرے ہی، میں لواخ کے تھلے پر جا کر مری کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا، جوں ہی سورج نے نتھیا گلی کی چوٹی سے جھانکا میرے

اندر سے توپیں داغنے کی آواز ابھری، میں نے ایک سسکی لی اور مجھے لگا کہ میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ یہ کیفیت اگلے چند ہی لمحے جاری رہی پھر میرے دل کو ایک غم آمیز سکون نے گھیر لیا؛ یہ سکون اس بات کی علامت تھا کہ بابا کی روح جسم چھوڑ چکی ہے اور اب ان کی وہ تمام اذیتیں ختم ہو چکی ہیں، جن سے وہ گرفتاری کے بعد سے گزر رہے تھے۔سو جب دوپہر کے وقت یہ خبر بستی میں پہنچی اور پوری بستی میں کہرام مچا تو میں اپنا غم آنسوؤں میں بہا چکا تھا،لیکن چچا نے شاید رات بھر ضبط کا دامن تھامے رکھا تھا تبھی دھاڑیں مار کر رونے لگ گئے تھے۔

مجھے یاد ہے میں اس وقت اپنے صحن میں لگے شہتوت کے درخت کے پاس کھڑا تھا، مجھے چچا کے عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر رونے پر شرم سی آ رہی تھی اور سوچ رہا تھا کہ لوگ چچا کے بارے میں کیا سوچیں گے کہ وہ بھائی کی موت پر عورتوں کی طرح رو رہا ہے۔وہ اچانک میری طرف بڑھے اور مجھے گلے لگا کر کہنے لگے۔"سکندر، صرف تم یتیم نہیں ہوئے، ہم سب یتیم ہو گئے ہیں۔وہ بھی یتیم ہو گیا ہے، جسے انھوں نے پنڈی کی جیل میں بھیج دیا ہے،اس علاقے کے سارے جنگجو یتیم ہو گئے ہیں۔ان ظالموں نے میرے لالا کا جسم ہوا میں بکھیر دیا ہے۔" میں نے انھیں تسلی دی اور چند آنسو بہانے پر اکتفا کیا۔

آزاد خان، میرے چچا، اپنے بھائی یعنی بابا سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی بات کو خدائی حکم سمجھتے تھے۔ایک دفعہ انھیں پتہ چلا کہ ڈنہ مساح کے کسی شخص نے بابا کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات کی ہے تو وہ اسی دن، اپنے چھوٹے بھائی فقیر خان کو ساتھ لے کر، شام کے وقت اس کے گھر پہنچ گئے اور اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ میں پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں اگر آئندہ تم نے لالا کی شان میں گستاخی کی تو تمھارے گھر آ کر تمھاری زبان کاٹ کر رکھ دوں گا۔جب اس گاؤں کے سردار نے بابا کو شکایت لگائی اور بابا نے چچا کو بلا کر ڈانٹا تو کہنے لگے لالا، مجھ سے آپ کی توہین برداشت نہیں ہوتی۔

انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو، جو دارا بھائی کی والدہ تھیں، محض اس لیے جذبات میں آ کر طلاق دے دی تھی کہ اس نے ایک دفعہ بابا سے چیخ کر بات کی تھی۔اس طلاق کی وجہ سے ہمارے خاندان میں بہت سے مسائل نے جنم لے لیا تھا۔ہماری پھوپھی کی شادی وٹے کے طور پر اسی خاندان میں ہوئی

تھی۔ بڑی مشکل سے اس معاملے کو سنبھالا گیا اور حسن علی خان کو یہ رشتہ بچانے کے لیے مداخلت کرنا پڑی تھی۔

بابا کو توپ سے اڑائے جانے کے تیسرے روز اطلاع ملی کہ گوروں کے سپاہیوں کا بندوقوں سے مسلح ایک دستہ کسی گورے کی سرکردگی میں بستی کی طرف آ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی میری دونوں ماؤں نے مجھے اور چچا کو بستی چھوڑ کر فرار ہونے کا کہا۔ چچا کے سارے بچے ابھی نابالغ تھے اور ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر کے دور ہی میں، ہمارے علاقے میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ انگریز اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں سے رعایت برتتے ہیں۔ چچا اڑ گئے اور کسی صورت بھی جانے پر راضی نہیں ہوئے۔ میں نے کہا: میں بھی نہیں جاؤں گا۔ چچا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہے۔ ہتھیار تیار رکھو مگر پہل نہیں کرنا، اگر انھوں نے عزت سے ہمیں گرفتار کیا تو گرفتاری دے دیں گے تاکہ باقی لوگ سلامت رہیں۔'' یہ سنتے ہی میری دونوں ماؤں نے اپنے دوپٹے میرے پاؤں میں ڈال دیے اور اپنے دودھ کا واسطہ دینے لگیں۔ چچا جو اس وقت ہمارے پاس ہی کھڑے تھے، بھاگتے ہوئے اصطبل میں گئے اپنا گھوڑا کھول کر لائے اور مجھے اس پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے انکار کیا تو حکماً کہا۔'' نہیں تم جاؤ۔ آخر ہم میں سے کسی کو تو زندہ رہنا چاہیے۔''

میں گھوڑے پر بیٹھا تو انھوں نے کہا۔''غلام خان ترین کے ہاں چلے جاؤ۔ اسے میرا اسلام کہنا۔'' میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور مغرب کی طرف فرار ہو گیا۔ میری روانگی کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر فوج مشرقی سمت سے بستی میں داخل ہو چکی تھی۔

❁

تیسرے دن، چچا عبدل شام کے وقت، غلام خان ترین کے ڈیرے پر آئے؛ بستی پر گزرنے والی قیامت کے نقوش، ان کے چہرے کی جھریوں پر ثبت تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا۔

''گوروں کی فوج نے بستی میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا کہ سب لوگ عورتوں اور بچوں سمیت اپنے گھروں سے باہر نکل کر میدان میں جمع ہوں۔ آزاد خان نے مزاحمت کی تو ان کا سینہ لمحوں میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ تمھاری ماؤں سمیت بہت سی خواتین نے میدان میں جمع ہونے کے بجائے اپنے

سینوں میں چھرے گھونپ دیے۔ جب گوروں نے یہ صورت حال دیکھی تو انھوں نے فوراً مداخلت کی۔ باقی ماندہ خواتین کے ہاتھوں سے چھریاں چاقو لے لیے اور انھیں ان کے گھروں سے باہر دھکیل کر مکانوں کو آگ لگا دی؛ شام تک ساری بستی راکھ میں تبدیل ہو چکی تھی۔

کل مرنے والے سب لوگوں کو دفنا دیا گیا ہے۔تمھاری دونوں ماؤں نے سینوں میں چھرا گھونپنے سے پہلے، مجھے بلوایا تھا اور میرے آگے ہاتھ جوڑے تھے کہ سکندر کو واپس بستی نہ آنے دینا۔"

میں دکھ سے پتھرایا ان کی باتیں سنتا رہا؛ مجھ میں رونے کی بھی سکت نہیں تھی۔ان کی باتیں ختم ہوئیں تو، میں نے غلام خان ترین سے کہا۔"مجھے ہر صورت جانا ہوگا۔"

"یہ قرین مصلحت نہیں۔جذبات سے کام نہ لو،تم سر دست کہیں نہیں جاؤ گے۔"انھوں نے کہا۔

عبدل چچا نے تھیلے سے بابا کی پگڑی اور پھر وہی تلوار، جس سے انھوں نے امر سنگھ کو قتل کیا تھا، نکالی اور مجھے تھمائی۔انھوں نے دوبارہ تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور بابا کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوشتہ میرے ہاتھ میں پکڑایا۔

چودہ

اگرچہ مری پر حملے میں شریک ہونے والوں کی زیادہ تعداد، مری کے نواح میں بسنے والے لوگوں کی تھی لیکن بغاوت کی ناکامی کے بعد جو پہلی بستی جلانے کا حکم دیا گیا وہ ہماری ہی تھی کہ انگریز سرکار کو اطلاع ملی تھی کہ اس بغاوت کا سارا منصوبہ ہمارے ڈیرے پر بنایا گیا ہے۔

اتنی دور بیٹھ کر یہ منصوبہ ترتیب دینے کی وجہ اسے پوشیدہ رکھنا تھا تاکہ حکام کو اس کی اطلاع نہ پہنچ سکے؛ لیکن ظاہر ہے یہ بات تمام دیہاتوں کے سرکردہ لوگوں کے، جو اس مشورے میں شریک تھے، علم میں تھی لہٰذا اتنی بھی پوشیدہ نہیں تھی۔

یہ بات درست ہے کہ اس منصوبے کی تیاری کا پہلا باقاعدہ اجلاس ہمارے ڈیرے پر ہوا تھا لیکن اس کا سب سے پہلا خیال، باز خان نے پیش کیا تھا، جو ملوٹ ڈھونڈاں کے رہنے والے تھے اور میری بڑی ماں کی برداری سے تعلق رکھتے تھے۔

انھیں پہلی مرتبہ یہ خیال اس واقعے کے رونما ہونے سے چند ماہ پیشتر، ہاڑ کی ایک تپتی دوپہر کو اس وقت سوجھا تھا، جب وہ اپنے گھر پہنچے اور انھیں پتہ چلا کہ گھر کی خواتین میں یہ بات کانا پھوسیوں کی صورت گردش کر رہی ہے کہ دلی میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کر دی ہے۔ انھوں نے بیوی کو کریدا تو معلوم ہوا کہ یہ اطلاع دناہ کی وادی سے ان کی بھتیجی لائی ہے، جس کی شادی وہیں کے ناظم خان کے بیٹے کے ساتھ چند ماہ پہلے ہوئی تھی۔ ناظم خان، جو ان کے بھائی کا سمدھی ہونے کے ناطے، اب ان کا قرابت دار بن گیا تھا، ایک انگریز افسر کا ذاتی ملازم تھا، اس لیے باز خان کی چھٹی حس نے انھیں

بشارت دی کہ یہ خبر سچی ہوگی۔ناظم کی بہو نے اپنی ماں اور چچیوں، تائیوں سے درخواست کی تھی کہ یہ بات کسی کے کانوں تک نہ پہنچے ورنہ وہ میرے سسر کو مار دیں گے۔ باز خان نے اس بات کی ٹوہ لگانے کا فیصلہ کیا اور اگلے ہی روز کوہِ دناہ کے دامن میں واقع ایک چھوٹی سی بستی میں، اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم ہو گئے۔ یہاں بھی خواتین میں یہ بات چل رہی تھی۔انھوں نے اپنے بھائی احمد خان کو جو حکم داد کے سمدھی تھے، وہاں بلا بھیجا۔احمد خان کو انھوں نے اعتماد میں لیا اور ان کے ساتھ ناظم خان کی بیوی سے ملے۔احمد خان نے باتوں باتوں میں اسے کریدا تو اس نے انھیں خدا کے واسطے دینا شروع کر دیے کہ اگر یہ بات کسی اور کو پتہ چل گئی تو گورے، میرے میاں کو پھانسی پر لٹکا دیں۔ باز خان نے اسے یقین دلایا کہ ناظم خان ہمارے بھائیوں کی طرح ہے، ہماری بچی اس گھر میں بیاہی ہوئی ہے؛ بھلا ہم ایسا کیوں کریں گے، جس سے وہ مطمئن ہوگئی اور اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہمارے گاؤں کے کچھ جوان، جو گوروں کی فوج میں ملازم ہیں، سرکار کی طرف سے لڑنے کے لیے دلی جا رہے ہیں، جن میں میرا سگا بھتیجا بھی شامل ہے، جو ترقی کر کے اب حوالدار بن چکا ہے۔

باز خان خود بھی ایک جنگجو تھے اور سکھوں کے خلاف ہونے والی جنگوں میں بابا کے ہمراہ شریک رہے تھے اور وہیں ان کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہوا تھا، جو بابا کے توپوں سے اڑائے جانے اور ان کے روپوش ہو جانے تک قائم رہا۔

اگلے دن انھوں نے میرے سوتیلے ماموؤں سے، جو ان کے عزیزوں میں سے تھے، رابطہ کیا اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ اگر اس معاملے میں تمھارے بہنوئی کا قبیلہ ہمارا ساتھ دے تو ہم آسانی سے مری پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ماموؤں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ احمد خان کو ہمارے ساتھ بھیجیں ہم خانی زمان بھائی سے بات کرتے ہیں۔احمد خان اسی رات میرے دونوں ماموؤں کے ساتھ، باز خان کا پیغام لے کر ہمارے ہاں آئے۔ بابا، ڈیرے پر تھے، احمد خان کو ڈیڑھی میں بٹھایا گیا، جس کا دروازہ میں نے خود کھولا تھا۔میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور دونوں ماموں، بڑی ماں سے ملنے زنان خانے میں چلے گئے۔کچھ دیر بعد وہ واپس ڈیڑھی میں آئے اور احمد خان کو ساتھ لے کر ڈیرے پر چلے گئے۔جہاں رات

پھر آپس میں صلاح مشورہ ہوتے رہے، جس کا پتہ مجھے بعد میں چلا۔

اگلی صبح میری نیند ابھی کسی خواب میں الجھی ہوئی تھی کہ آزاد چچا کی آواز سنائی دی وہ ہمارے اور اپنے گھر کے درمیان موجود ٹھلے کے اوپر سے مجھے پکار رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر باہر نکلتا بڑی ماں کمرے میں داخل ہوئیں اور کہنے لگیں: جلدی سے تیار ہو جاؤ، تم نے چچا کے ساتھ کہیں جانا ہے۔

میں باہر آیا تو میری دونوں مائیں ناشتہ بنانے میں جتی ہوئی تھیں، بڑے چچا نے انھیں پیغام دیا تھا کہ مہمانوں کے لیے ناشتہ جلدی سے ڈیرے پر پہنچائیں، بھائی صاحب یہیں آ رہے ہیں، میں بھی ان کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔ میں ناشتے کا انتظار کرنے کے بجائے چچا کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے انھیں پکارا تو انھوں نے ''آجاؤ'' کا آوازہ بلند کیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ نیا لباس زیب تن کر چکے تھے اور میری چچی ان کی گود میں ایک پرانا کپڑا بچھائے، ان کی ڈاڑھی میں تیل لگا رہی تھیں۔ انھوں نے چچی کو اشارے سے روکا اور مجھے حکم دیا کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ تم نے فقیر خان کے ساتھ کہیں جانا ہے؛ آج وہ تمھیں خچر کی سواری کرائے گا۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا اور جانے کو مڑا تو انھوں نے پیچھے سے آواز دی۔ ''ہاں سنو۔ چھوٹے چچا سے کہو کہ وہ گھوڑوں اور خچروں کو تیار کرے، لالاجی پہنچنے والے ہیں۔''

چچا، جو بابا کی طرح ہر کام عموماً سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے کرتے تھے اور مجھ سمیت بستی کے سارے بچوں کو اس کی تاکید کرتے تھے، اس دن خلاف معمول عجلت میں لگ رہے تھے۔

ماں نے میرے کپڑے ہاتھ میں پکڑائے، میں کپڑے لے کر چھپر چھوپی میں گھس گیا۔ نہا دھو کر واپس پہنچا تو دہی، لسی اور مکئی کی روٹی کا ناشتہ دری پر پروسا جا چکا تھا۔ بابا، دونوں چچا، اور میرے دو چچازاد، جن میں سے ایک کی عمر پندرہ سال اور دوسرے کی تیرہ سال تھی، میرے منتظر تھے۔ جن دنوں بابا گھر میں ہوں دونوں چچا ہمیشہ انھی کے ساتھ ناشتہ کرتے اور کھانا کھاتے تھے۔ ہمارے خاندان میں سات سال سے چھوٹے بچے، زنان خانے میں خواتین کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ جوں ہی بچے کی عمر سات سال ہوتی، اسے مردوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے کی اجازت مل جاتی؛ یہ ایک طرح کا

غیر تحریر شدہ قانون تھا، جس کی پابندی لازمی ہوتی تھی اور خواتین اس پر سختی سے عمل کراتی تھیں۔

جوں ہی میں دری پر بیٹھا، بابا نے بسم اللہ پڑھی چھوٹے چچا، فقیر خان نے مکئی کی روٹی کو تین برابر حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصہ بابا کو دوسرا آزاد چچا کو تھمایا اور تیسرے حصے سے خود نوالے توڑنے لگے۔ تینوں بھائی ہمیشہ اسی طرح کھانا کھاتے تھے۔ میرے چھوٹے چچازاد نے ان کی پیروی کی اور ہم بھی ان کے ساتھ ناشتے میں شریک ہو گئے۔ جوں ہی ہم ناشتے سے فارغ ہو کر اُٹھنے لگے بابا نے دونوں بھائیوں کو علاحدہ لے جا کر سرگوشی کے انداز میں کچھ سمجھانا شروع کر دیا۔ میں اور میرے چچازاد پرے ہٹ گئے، کہ مبادا ہمیں بے ادب سمجھ لیا جائے۔ ہم کچھ فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے چلتے اس باڑے تک آ گئے تھے، جہاں دوسرے ڈھور ڈنگروں کے ساتھ ہمارے گھوڑے اور خچر بندھے ہوئے تھے۔ چھوٹے چچا اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور بڑے چچا نے مجھے خچر پر بیٹھنے میں مدد دی۔ انھوں نے خچر کی باگ میرے ہاتھ میرے تھماتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سنبھل کے جانا۔''

جب ہم روانہ ہوئے تو سورج مشرقی پہاڑی سے طلوع ہو کر کافی بلندی پر آ چکا تھا۔ موسم اگرچہ گرم تھا لیکن ابھی تپش زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارا رخ جنوب مغرب کی طرف تھا، کچھ ہی دیر میں گاؤں سے نکل کر ہم اس جنگل میں داخل ہو گئے جہاں سے گاؤں کے لوگ عمارتی اور سوختنی لکڑی کاٹ کر لایا کرتے تھے۔ جنگل میں سب سے بلند درخت چیڑ کے تھے لیکن وہ اکا دکا تھے زیادہ تر درخت کاہو، انجیر سیاہ، انار دانے، ناخ، بٹنگ، ناشپاتی اور کچنار کے تھے۔ انجیر سیاہ کے درخت پکے ہوئے پھلوں سے لد چکے تھے جب کہ انار دانے، ناشپاتیوں اور ناخوں کی شاخوں پر کھلے پھول چھوٹے چھوٹے پھلوں میں ڈھلنا شروع ہو گئے تھے۔

ہم ایک تنگ گھاٹی سے گزر کر پہاڑ کے دوسری طرف آ گئے جہاں نشیب میں دریائے ہرو بہہ رہا تھا اور سامنے دور تک پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا، جن کی چوٹیوں پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے؛ بل کھاتے رستے پر ہمارا سفر نشیب کی طرف تھا۔

گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ہم پہاڑ سے اتر کر ہرو کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے۔ ہمارا سفر

پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تھا، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد ہمیں کوئی نہ کوئی جندر دکھائی دیتا۔ میری خواہش تو تھی کہ چچا سے کہوں کہ میں جندر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن خاموش رہا۔ کافی دیر بعد ہم دریا کنارے ایک چشمے پر ستانے کے لیے رکے۔

''اس سے آگے زمین ہموار ہے۔ اب ہمیں تیز چلنا ہوگا تاکہ ہم دوپہر سے پہلے پہلے وہاں پہنچ سکیں۔'' یہ پہلی گفتگو تھی جو پچھلے دو گھنٹوں میں چچا نے مجھ سے کی۔ مجھے یہ تک نہیں بتایا گیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ بڑی ماں کے مائیکے کی طرف ایک رستہ اس طرف سے بھی جاتا ہے لیکن اگر ہم وہاں جا رہے تھے تو یہ بات مجھ سے چھپائی کیوں گئی تھی۔ پھر یہ سوال بھی تھا کہ ہم وہاں کس مقصد کے لیے جا رہے ہیں اور میرے ماموں، جو رات کو دناہ کی وادی سے آئے تھے وہ ہمارے ساتھ واپس کیوں نہیں جا رہے، ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، جو میرے تجسس کو بڑھاوا دے رہے تھے۔

''ہم کب پلٹیں گے۔''، میں نے منہ پر تازہ پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا فیصلہ وہاں جا کر ہی کریں گے۔ ہوسکتا ہے ہمیں رکنا پڑے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

فقیر چچا اپنے دونوں بڑے بھائیوں؛ بابا اور آزاد چچا کے برعکس ایک خاموش طبع آدمی تھے، وہ اپنے ہم عمروں میں بھی بہت کم گھلتے تھے، بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اس خاموشی نے ہمارے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی تھی، جس کی وجہ سے میرے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ اس وقت ان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔

بچپن میں تو وہ مجھے ہمیشہ خفا ہی دکھائی دیتے تھے، جس کی وجہ سے مجھے، اور ان کے بچوں کو ہمیشہ ان سے ڈر ہی لگا رہتا تھا۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ انھوں نے مجھے یا اپنے بچوں میں سے کسی کو کبھی مارا پیٹا ہو؛ یہاں تک کہ انھوں نے ہمیں ڈانٹا بھی بہت کم لیکن ان کی خاموشی نے ہمارے دلوں میں ان کا رعب قائم کر دیا تھا اور یہ ایسا رعب تھا کہ جوں ہی ہم میں سے کوئی، ان کی آواز سنتا، ہم ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح ان کی سمت دوڑے چلے جاتے؛ ان کے برعکس ہماری مائیں تھیں، جو

ہمیں ہر وقت مارتی پیٹتی رہتی تھیں۔ایک دفعہ تو چھوٹی ماں نے مجھے کاہو کی سوٹی سے اتنا مارا تھا کہ میرے جسم پر نیل پڑ گئے تھے، بڑی ماں نے بہت مشکل سے مجھے ان کے چنگل سے چھڑایا تھا اور وہ رات کے پچھلے پہر تک میرے زخموں کو سہلاتی رہی تھیں لیکن جب میں سو کر صبح اٹھا تو ان کا رعب اور دبدبہ ختم ہو چکا تھا۔

مائیں ہمیں بسا اوقات پکارتی ہی رہ جاتیں اور ہم شرارتوں میں مصروف رہتے لیکن جوں ہی چچا گھر میں داخل ہوتے ہمیں سانپ سونگھ جاتا۔ چچاؤں اور بابا کا رعب اور دبدبہ ہمارے ذہنوں میں بٹھانے میں ہماری ماؤں کا بڑا ہاتھ تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو بابا کو طویل سفروں پر ہی آتے جاتے دیکھا آزاد چچا ان سفروں میں عموماً ان کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔کئی دفعہ مجھے بتایا گیا کہ بابا اور بڑے چچا ملک پکھلی گئے ہوئے ہیں جو، ان دنوں ہمیں کوئی دوسری دنیا معلوم ہوتا کہ بابا جب بھی وہاں جاتے کئی کئی ہفتوں کے بعد آتے۔ان کی غیر موجودگی میں ہمارے خاندان کی سربراہی چھوٹے چچا ہی کے ہاتھ میں رہی لیکن وہ بچوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

ہم نے کب اٹھنا ہے، کب سونا ہے اور کہاں جانا ہے اس کا فیصلہ ہماری ماؤں کے ہاتھ میں ہوتا۔جب ہم چچا زادوں میں سے کوئی شرارت کرتا یا کسی سے بدتمیزی کرتا تو بڑی ماں فوراً دھمکی دیتیں۔ ''آنے دے فقیر خان کو۔اگر ان سے تم لوگوں کی کھال نہ کھینچوائی تو میرا نام بدل کے رکھ دینا۔''اس کے باوجود ہم باز نہ آتے؛ لیکن جوں ہی چچا گھر میں داخل ہوتے، ہم سہم سے جاتے کہ ابھی بڑی ماں ہماری شکایت کرے گی اور ہماری کھال کھینچوائے گی۔میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے کبھی ان سے ہماری شکایت کی یا نہیں لیکن انھوں نے کبھی ہمیں مارا نہیں۔زیادہ سے زیادہ ہمیں ہماری کسی شرارت پر صرف ڈانٹا، جو ہمیں مار سے زیادہ بھیانک محسوس ہوتی تھی۔

❁

فقیر چچا کو اپنی نوجوانی میں کسی دوسری بستی کی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا، پہلے تو ہمارے دادا

نہیں مانے کہ وہ اپنے اور اپنے ننھیالی قبیلے کے باہر سے کوئی رشتہ قبول کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب حسن علی خان کے والد سردار مہند علی خان نے انھیں سمجھایا کہ وہ لوگ خوانین میں سے ہیں اور رشتہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تو وہ رشتے کا پیغام بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر رشتہ مانگنے اس لڑکی کے خاندان میں گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ہمارے ہاں کسی دوسری برادری میں رشتوں کا لین دین برا سمجھا جاتا ہے۔ سو اب کی بار ان کا رشتہ، ان سے پوچھے بغیر، ان کے ننھیالی قبیلے میں طے کر دیا گیا اور وہ خاموش ہو گئے کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

سال بھر بعد جب ان کی بارات ڈولی لینے پہنچی تو دستور کے مطابق دلھا کو نشانہ لگا کر ٹمن گرانا تھا۔ ٹمن زیادہ بلندی پر بھی نہیں باندھا گیا تھا لیکن اس کے باوجود تینوں بار ان کا نشانہ خطا گیا، جس کی وجہ سے بارات کو ڈولی کے بغیر پلٹنا پڑا۔ ساری بارات حیران تھی کہ فقیر خان جیسے نشانہ باز سے، جو اڑتی چڑیا کو غلیل سے گرا دیتا ہے، کاہو کی شاخ پر باندھی گئی سرخ مرچ نہیں گرائی جا سکی۔

اسی سال دونوں قبیلوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ آئندہ سے ٹمن گرانا دولھے کے لیے ضروری نہیں، بارات میں شامل کوئی بھی نشانہ باز ٹمن گرا سکتا ہے، یوں ان کے نشانہ چوکنے کی وجہ سے دولھوں پر سے یہ پابندی اٹھا دی گئی۔

دادا اور بابا اسی دن جان گئے تھے کہ چچا نے جان بوجھ کر نشانہ خطا کیا سو اس کے بعد انھوں نے کبھی انھیں شادی کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

❁

اس دن وہاں ہر وکنارے ابلتے چشمے سے پانی پیتے ہوئے میرا بہت دل چاہ کہ میں چچا سے پوچھوں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ جب سے انھوں نے مجھے کچی نیند سے جگا کر حکم دیا تھا کہ تیاری پکڑو کہیں جانا ہے تو میرے اندر فوراً اس سوال نے جنم دیا تھا کہ کہاں؟ حالاں کہ اب میں بچہ نہیں رہا تھا، ایک کڑیل جوان کا روپ دھار چکا تھا۔

صبح جب میں ان کے حکم کی تعمیل میں جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا تو کئی بار

میرا ذہن للچایا کہ ان سے پوچھوں لیکن مجھے ہمت نہ ہوئی۔

ندی کنارے جب پانی پی کر میں نے منہ پر تازہ پانی کے چھنٹے مارے تو میرا وہ تجسس دوبارہ بیدار ہوا کہ میں ان سے معلوم کروں کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور کس سے ملنے جارہے ہیں، لیکن میں ان سے اتنا ہی پوچھ سکا کہ کب پلٹیں گے۔

ہم ندی کنارے بیٹھے کافی دیر اپنے گھوڑے اور خچر کو دیکھتے رہے، جو ندی کنارے اگی جھاڑیوں میں منہ مار رہے تھے۔ اگر چچا ساتھ نہ ہوتے تو میں پانی میں کنکر مار کر اس سے اٹھنے والی لہروں سے لطف اندوز ہوتا جو ہمیشہ سے میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ میں نے بے دھیانی میں ایک کنکر پانی میں پھینکا جوں ہی اس کے پانی میں گرنے کی آواز آئی یک دم مجھے اپنے چچا کا خیال آیا اور مجھے دھچکا سا لگا جیسے میں نے کوئی بہت بڑی گستاخی کر دی ہو۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں تھے اور انھوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا بھی نہیں؛ شاید انھوں نے کنکر کے پانی میں گرنے کی آواز بھی نہیں سنی تھی لیکن میں نے خیال رکھا کہ کہیں بے دھیانی میں پھر کوئی پتھر پانی میں نہ پھینک دوں۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ندی کے پار رستے پر نظریں گاڑے ہوئے تھے اور میں انھیں کن انکھیوں سے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک انھوں نے میری طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جوں ہی انھوں نے میری طرف گردن گھمائی میں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور میرے کانوں سے ان کی آواز ٹکرائی: ''چلو۔'' اور میں سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح، ان کے پیچھے پیچھے گھوڑے اور خچر کی طرف چل پڑا۔

چھ سات میل کی مسافت کے بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں شمالی ہرو اور جنوبی ہرو آپس میں مل کر ایک دریا کی شکل اختیار کر جاتی ہیں؛ وہاں سے ہم موڑ کاٹ کر جنوبی ہرو کے ساتھ ساتھ، بہاؤ کی الٹی سمت سفر کرنے لگے۔

رستہ ہموار ہونے کی وجہ سے ہماری سواریاں سرپٹ بھاگ رہی تھیں اور ان کی ٹاپوں کی گونج، ندی کے پانی کے شور سے مل کر ایک عجیب سا سماں باندھ رہی تھیں۔ میں نے اگرچہ گذشتہ دس برسوں میں گھر سے مانگل تک کا طویل سفر ہر سال دو سے زائد مرتبہ کیا تھا لیکن ندی کنارے سواری کرتے

ہوئے مجھے بہت لطف آرہا تھا، جس کی وجہ سے میرے ذہن سے وہ تمام سوالات محو ہو گئے، جو پہاڑ سے اترتے وقت، مجھے بار بار تنگ کر رہے تھے۔

چچا کو، جن کا گھوڑا میرے آگے آگے سرپٹ بھاگ رہا تھا، جب محسوس ہوتا کہ میں تھوڑا پیچھے رہ گیا ہوں تو وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے اور گھوڑے کو ذرا آہستہ کر لیتے تاکہ میں انھیں پہنچ سکوں۔ میں بار بار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا جو ہمارے دائیں بائیں موجود بلند و بالا پہاڑوں پر ٹنگا ہوا محسوس ہوتا۔ میں اس نظارے میں اتنا کھو سا گیا کہ چچا سے بہت پیچھے رہ گیا۔ رستہ چوں کہ ندی کے ساتھ بار بار بل کھا رہا تھا اس لیے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں نے خچر کو چابک رسید کی اور وہ سرپٹ بھاگنے لگا کچھ ہی دیر بعد جب میں نے موڑ کاٹ کر دیکھا تو وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے خچر کی باگ کھینچ کر اسے پہلے ہی آہستہ کر لیا کہ مبادا ان سے آگے نکل جاؤں۔

''تھک گئے ہو۔'' جب میں ان کے قریب پہنچا تو انھوں نے پوچھا۔ ان کی آواز میں ایک خاص طرح کی نرمی تھی؛ ایسی نرمی جس سے میں پہلے آشنا نہیں تھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اگرچہ ہماری منزل بالکل قریب ہے لیکن اگر تھک گئے ہو تو آگے ایک جندر آرہا ہے، وہاں رکتے ہیں۔''

''جی۔ تھوڑی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے کوئی خاص تھکاوٹ نہیں ہوئی تھی؛ میں یہاں کے جندر دیکھنا چاہتا تھا، جن کے بارے میں، میں نے سنا تھا کہ ان کے پاٹ بہت بڑے ہوتے ہیں، ہمارے علاقے کے جندروں سے دگنے؛ اس کے باوجود وہ ان جندروں کے مقابلے میں دگنی رفتار سے گھومتے ہیں۔

تھوڑی دیر میں ہم جندر پر پہنچ چکے تھے۔ چچا نے اتر کر سواریوں کو جندر کے آگے موجود درختوں کے ساتھ باندھ دیا تاکہ وہ جندر کے ساتھ بنے کھیت میں اگی سبزیوں اور اگیتری فصل میں منہ نہ مار سکیں۔ اتنے میں جندروئی جو، چونگ جندر پر چڑھا کر، جندر کے پیچھے موجود کھیت سے چارہ کاٹ رہا تھا، چارے کا گٹھڑا اٹھائے ہمارے طرف آیا، اس نے چچا کو ہندوؤں کی طرح پرنام کیا اور گٹھڑے کا سُبھ کھول

کر،اس میں سے کچھ چارہ ہمارے جانوروں کے آگے ڈال دیا۔

گھوڑا اور خچر چارے میں منہ مارنے لگے اور وہ چچا کے پاس آ کر جندر کے باہر بنے تھلّے پر بیٹھ گیا، میں اس وقت جندر میں جھانک کر اس کی بناوٹ پر غور کر رہا تھا۔ اس نے چچا سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں تو مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے نہ تو اپنا اصلی نام بتایا اور نہ ہی گاؤں کا؛ انھوں نے اپنے گاؤں کا نام بگڑہ بتایا۔ بگڑہ کا نام سن کر اس شخص نے کسی ہندو کے بارے میں دریافت کیا تو چچا نے اس سے پوچھا کہ وہاں اس نام کے دو لوگ ہیں، آپ کون سے والے کا پوچھ رہے ہیں تو اس نے بتایا جس کی وہاں دکان ہے۔ چچا نے کہا کہ اسے کون نہیں جانتا۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے، جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی؛ میں تو چچا کی طرف سے بولے گئے جھوٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مجھے زیادہ حیرانی اس لیے ہو رہی تھی کہ میں نے انھیں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بہت سال پہلے، جب میری عمر آٹھ سال کے لگ بھگ تھی، ایک دن میں مسجد جانے کے بجائے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا تھا؛ کھیلتے کھیلتے، میں نے ایک لڑکے کی پٹائی کر دی تھی، واپسی پر جب میں سنتھے کی جھاڑی سے اپنا سپارہ نکال کر گھر جا رہا تھا تو اس نے دیکھ لیا تھا۔ اگلے دن، جب میں مسجد گیا ہوا تھا تو اس نے ماں کو بتا دیا کہ میں کل مسجد جانے کے بجائے کھیلنے چلا گیا۔ جب میں گھر آیا تو چھوٹی ماں نے مجھ سے اس بابت پوچھا اور میں صاف مکر گیا تو انھوں نے مجھے پہلی بار کمرے میں بند کر کے سوٹیوں سے مارا تھا۔ اس سے پہلے وہ مجھے صرف طمانچے رسید کیا کرتی تھی؛ تب سے میں نے جھوٹ بولنے سے توبہ کر لی تھی۔ اس کے بعد، میں جب بھی کچھ الٹا سیدھا کر آتا اور ماں مجھ سے پوچھتیں تو میں فوراً سچ بتا دیتا اور وہ مجھے ڈانٹ کر چپ ہو جاتیں۔

اُس روز جب میں نے ایک اجنبی کے ساتھ، اپنے چچا کو صریحاً جھوٹ بولتے دیکھا تو حیرت بھی ہوئی اور تجسس بھی۔

جب میں دوبارہ ان کے قریب آیا تو وہ فصلوں کے بارے میں گفتگو کر رہے؛ چچا اس کی اگیتری مکئی کی تعریف کر رہے تھے، میں نے اردگرد کے کھیتوں پر نظر دوڑائی؛ مکئی واقعی بہت اچھی

تھی۔ ہماری بارانی زمینوں میں تو ابھی پچھلے دنوں مکئی بیجی گئی تھی اور اس کے بیجوں نے ابھی بمشکل زمین سے سر نکالا تھا۔

ہم پھر سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے؛ چند سو گز کی مسافت کے بعد ہم دریا سے الگ ہو کر ایک تنگ درے میں بہنے والی ندی کی طرف مڑ گئے، جس کے دونوں اطراف درختوں سے ڈھکی ہوئی، اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ بعض جگہوں سے ندی کا پاٹ اتنا تنگ تھا کہ ہمیں بہتے پانی میں سے رستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم ندی سے الگ ہو کر بائیں مڑ گئے اور بل کھاتے رستے پر چڑھائی چڑھنے لگے۔ آگے کا سارا رستہ ہمارے علاقوں کے عام پہاڑی رستوں کی طرح تھا، جس میں میری دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔

میل بھر مزید چلنے کے بعد ہم ایک دوراہے سے دائیں جانب مڑ کر ایک کھلی وادی میں داخل ہو گئے، جہاں چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ پہاڑوں میں گھری اس وسیع وادی پر نظر پڑتے ہی میں پہچان گیا کہ ہم کوہِ دناہ کے دامن میں پہنچ چکے ہیں، جہاں میں بچپن میں ایک دو مرتبہ آیا تھا لیکن کسی دوسرے راستے سے، جو نسبتاً مختصر تھا۔

ہم ایک گھر میں داخل ہوئے جو ہمارے ڈیرے کی طرح عالی شان تو نہیں تھا لیکن خاصا وسیع تھا؛ ہمیں ایک ڈیڑھی میں لے جایا گیا، جس میں بڑی بڑی چار پائیں بچھی ہوئی تھیں۔

ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے دروازے سے، جو گھر کے اندر کی طرف کھلتا تھا، ایک صاحب، جنھوں نے خاصی بھاری پگڑی باندھی ہوئی تھی، داخل ہوئے۔ ان کی ڈاڑھی بھی قرینے سے ترشی ہوئی تھی اور ان کے لباس سے عطر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک دو اور بھی لوگ تھے لیکن ان کے لباس عام سے ہی تھے؛ بھاری پگڑی والے صاحب چچا سے بغل گیر ہو گئے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے۔ پھر جب انھوں نے پیچھے ہٹ کر مصافحہ کیا تو چچا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سکندر۔ لالاجی کا بیٹا۔'' یہ سنتے ہی انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے شفقت کا اظہار کیا۔

کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے سے حال احوال اور ایک دوسرے کے خاندان کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ دیگر لوگوں کا حال احوال بھی پوچھا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔اتنے میں ہمیں اطلاع دی گئی کہ کھانے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلیں۔کھانا کھانے کے بعد ہم دوبارہ اسی کمرے میں آئے اور سب پرانی یادوں کو تازہ کرنے لگے جو زیادہ تر جنگوں ہی کے متعلق تھیں۔اپنے خاموش طبع چچا کو میں نے پہلی مرتبہ اتنی زیادہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ان کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ بڑی پگڑی والے صاحب کا نام باز خان ہے اور وہ بھی ہماری طرح یہاں مہمان ہی ہیں۔اس گھر کا مالک وہ دوسرا شخص ہے جو میرے ساتھ والی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔باز خان کا نام میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ سن رکھا تھا، جب وہ باتیں کر رہے تھے تو میری نظریں انھی پر جمی ہوئی تھیں؛ اُن کے چہرے کے نقوش خاصے کھردرے سے تھے اور دورانِ گفتگو ان کی پیشانی پر پڑنے والے بل اس کھردراہٹ کو مزید نمایاں کرتے تھے۔

پھر انھوں نے میزبان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور وہ تمام لوگوں کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ان کے جاتے ہی چچا اور وہ دونوں کمرے کے آخری کونے میں بیٹھ کر سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے۔

میں ان کی باتیں پوری طرح نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ کمرہ خاصا بڑا تھا اور وہ باتیں بھی آہستہ آہستہ کر رہے تھے؛ مجھے اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ وہ کسی حملے کی تیاری کی باتیں کر رہے ہیں۔ان کی گفتگو گھنٹا بھر جاری رہی۔

ظہر کی نماز پڑھ کر چچا نے اجازت چاہی اور ہم نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔جب ہم دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے اور سستانے کے لیے رکے تو چچا نے مجھے سارے معاملے سے آگاہ کیا اور تلقین کی کہ اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کرنا کہ ہم کہاں گئے تھے اور کس سے ملے تھے۔ہوسکتا ہے کچھ دنوں بعد تمھیں یہاں پیغام رسانی کے لیے اکیلے آنا پڑے، ہم کسی اور پر بھروسا نہیں کر سکتے۔جب بھی یہاں آنا پڑے اسی رستے سے آنا؛ دوسرے رستے پر لوگوں کی آمدورفت زیادہ ہے، کسی کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو مخبری ہوسکتی ہے۔

اس دن جب ہم واپس گھر پہنچے تو عشا کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ہم گھر جانے کے بجائے سیدھے

ڈیرے پر گئے ۔ بابا،میرے دونوں ماموں اوراحمد خان؛حسن علی خان سے مل کر واپس آ چکے تھے ۔

۞

انگریز حکام نے ہزارہ میں اپنے قدم جماتے ہی حسن علی خان سے ملاقات کی تھی اوران کی ریاست، اس معاہدہ کے تحت برقرار رہنے دی تھی کہ وہ ہر سال کمپنی کی حکومت کو، ایک مخصوص مالیہ ادا کریں گے اوراپنے علاقے سے باہر کسی بھی خطے میں انگریزوں کے خلاف ہونے والی کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیں گے ۔

حسن علی خان، انگریزوں کی طاقت سے پوری طرح واقف تھے ۔اُس دن جب بابا، احمد خان اورمیرے دونوں ماموں یہ معاملہ ان کے سامنے رکھنے گئے تو انھوں نے کہا تھا کہ معاملہ بہت نازک ہے، پہلے میں اس معاملے کی پوری چھان پھٹک کرلوں، اس کے بعد فیصلہ کریں گے؛ چناں چہ وہ سب واپس آ گئے تھے ۔

اگلے کچھ دنوں میں حسن علی خان نے، جب اپنے ذرائع سے پتا چلایا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف باز خان کی خبر سچی ہے بلکہ سرکار مری اور ایبٹ آباد کی چھاؤنیوں میں تعینات کچھ پلٹنوں کو کمک کے طور پر واقعی دلی بھیج رہی ہے اور یہ کہ روانگی کی تیاری مکمل ہو چکی ہے ۔

تصدیق ہوتے ہی حسن علی خان نے مختلف بستیوں میں آباد، اپنے قبیلے کے سرکردہ لوگوں کا ایک خفیہ اجلاس ہمارے ڈیرے پر بلایا اور انھیں صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد، ان سے مشورہ مانگا تھا۔حسن علی خان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ وہ کبھی اپنا کوئی فیصلہ قبیلے پر ٹھونستے نہیں تھے ۔ اگر دل میں کوئی فیصلہ کر بھی لیتے تو اس وقت تک اسے عملی جامہ نہیں پہناتے تھے جب تک لوگوں کی اکثریت، اس پر متفق نہیں ہو جاتی تھی؛ باقی لوگوں کو وہ دلیل سے قائل کرکے اپنا ہم نوا بنا لیتے تھے ۔

اس دن جب انھوں نے قبیلے سے مشورہ مانگا تو سب نے رائے دی کہ یہ ایک اچھا موقع ہے،ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ان لوگوں کو یہ بھی یقین تھا کہ دلی میں موجود شاہی فوجوں نے شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی سرکردگی میں اگر بغاوت کا علم اٹھایا ہے تو پوری تیاری سے اور سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا

ہوگا،اس لیے مسلم افواج ان علاقوں کو بھی انگریزوں سے واپس چھین لیں گی ،جو پچھلے سو سال میں کمپنی کی حکومت نے ان سے چھینے ہیں۔ان سب کی خواہش تھی کہ اس سے پہلے کہ دلی سے مسلمانوں کی فتح کی خوش خبری آئے ہمیں مری کی فتح کی خبر دلی بھجوانی چاہیے تا کہ ان کے حوصلے مزید بلند ہوں۔

اسی شام مجھے ذمے داری سونپی گئی کہ میں کوہِ دناہ کے دامن میں واقع اسی گھر میں جا کر باز خان کو اطلاع دوں کہ وہ یہاں آئیں۔حسن علی خان نے اگلی صبح پو پھٹنے سے پہلے، مجھے رخصت کرتے ہوئے خصوصی طور پر تاکید کی کہ باز خان اکیلے آئیں، وہاں سے زیادہ آدمیوں کے ہماری ریاست میں آنے سے انگریزوں کو شک ہوسکتا ہے۔شام تک میں اور باز خان علاحدہ علاحدہ رستوں سے ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔

باز خان نے انھیں یقین دلایا کہ ان کا پورا قبیلہ اس جنگ میں بھر پور حصہ لے گا۔حسن علی خان نے کہا کہ میری پیرانِ پلاسی سے بات ہو چکی ہے، وہ بھی اس سلسلے میں ہمارا ساتھ دیں گے، جس سے باز خان کو خاصا اطمینان ہوا کہ پیرانِ پلاسی کے مریدین کا ،اس علاقے سے باہر بھی ایک وسیع دائرہ تھا اور راجاؤں کے ساتھ ہونے والی لڑائیوں میں ان کی تقریروں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

یہ اجلاس دو دن تک ہمارے ڈیرے پر جاری رہا۔مری چھاؤنی کی جغرافیائی صورت حال کے پیش نظر حسن علی خان نے تجویز دی کہ دو میل لمبی اور ایک میل چوڑی اس چھاؤنی پر چاروں طرف سے ایک ساتھ حملہ کیا جائے گا۔ہمارا قبیلہ شمال کی جانب سے حملہ کرے گا کہ باقی اطراف سے اس کا وہاں پہنچنا ناممکن ہے جب کہ میر باز خان کا قبیلہ، جو چھاؤنی کے چاروں طرف آباد ہے بیک وقت مشرق ،مغرب اور جنوب کی طرف سے حملہ کرے گا، تا کہ انگریز فوج کو ، جسے پہلے ہی افرادی قوت کی کمی کا مسئلہ درپیش ہوگا، سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔

اس دوران یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا کہ دونوں کو یہ کیسے معلوم ہوسکے کہ اب حملہ کرنا چاہیے۔کافی سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ مقامی مسجدوں سے جوں ہی عشا کی اذانیں بلند ہوں فوراً دھاوا بول دیا جائے گا اور اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ کوئی شخص عشا کی نماز نہ پڑھے۔سب کا خیال تھا کہ صبح کی اذانیں ہونے سے پہلے پہلے، جب کہ ابھی عشا کی نماز قضا نہیں ہوئی ہوگی، ہم لوگ چھاؤنی پر قبضہ کر چکے ہوں گے۔

حسن علی خان نے باز خان کو، جن کا گاؤں کوہ مری کی مشرقی سمت تھا، یہ تجویز دی کہ وہ اپنے علاقے کی جغرافیائی صورت حال کے مطابق لوگوں کے مری کی جانب کوچ کرنے کے مقامات کا تعین کریں۔

ہمارے قبیلے کی تمام بستیوں کے منتخب جنگجو، باڑیاں کے مقام پر جمع ہوں گے۔ جہاں سے وہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں آسانی سے چھاؤنی تک پہنچ سکیں گے۔ حملے کو خفیہ رکھنے کے لیے یہ بھی طے پایا کہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں سفر کریں تاکہ وہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔

پھر انھوں نے بابا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے قبیلے کی طرف سے پیش قدمی تمھاری سرکردگی میں ہوگی، جس پر حاضرین مجلس نے انھیں باقاعدہ مبارک باد دی۔ اجلاس کے آخر میں دعائے خیر کی گئی۔

پندرہ

ناظم خان کا نام میں نے پہلی مرتبہ اس دن سنا تھا جب میں فقیر چچا کے ساتھ کوہِ دناہ کے دامن میں واقع اس بستی گیا تھا، جہاں باز خان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس روز باز خان اور چچا کے درمیان ہونے والی بات چیت میں یہ نام بار بار آ رہا تھا۔ وہاں مجھے اتنی ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ وہ احمد خان کی بیٹی کا سسر ہے اور احمد خان کی بیٹی کو اسی کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ دہلی میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ پھر اسی کی بیوی کے ذریعے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ان کی مدد کے لیے یہاں سے مسلح دستے روانہ کیے جا رہے ہیں، جس میں ان کے علاقے کے کچھ نوجوان سپاہی بھی شامل ہیں۔

یہی نام میں نے دوسری مرتبہ غلام خان ترین کے منہ سے سنا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ پھاگن کے ابتدائی دنوں کی ایک سرد شام تھی اور بستی پر قیامت گزرے اور مجھے ان کے ہاں قیام کیے چھ ماہ سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔

غلام خان ترین کے ساتھ ہمارے خاندان کا پرانا تعلق تھا؛ ان کے والد محمد خان ترین میرے دادا کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ جنگ مانگل میں، جو محمد خان ترین کی سرگردگی میں لڑی گئی تھی، اگرچہ ہمارے قبیلے نے حصہ نہیں لیا تھا لیکن دادا، ذاتی تعلقات کی وجہ سے، بابا کو ساتھ لے کر اس جنگ میں حصہ لینے گئے تھے۔

بابا کے نوشتے کے مطابق:

''محمد خان ترین ہمارے خطے کے پہلے فرد تھے، جنھوں نے میدان ہزارہ میں سکھوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی اور ہزارہ کا پہلا گورنر انھی کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا۔ مانگل کی جنگ میں انھیں ہری سنگھ کے مقابلے میں بدترین شکست ہوئی، جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی طرف سے جنگِ گندگر میں، ہری سنگھ نلوہ کو بھی مار دیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ ان کے زخم سہہ گیا اور ایک مہینے زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد، دوبارہ زندگی کی طرف پلٹ آیا ہے۔ ہری سنگھ کی اس بدترین شکست کی وجہ سے سکھ سلطنت کی بانی مائی سدا کورکو، رنجیت سنگھ کے ہمراہ، جو اُن دنوں، اس کا داماد ہونے کے ساتھ سکھ سلطنت کا والی بھی تھا، لاہور سے ہزارہ آنا پڑا تھا۔ مائی سدا کورکو اندازہ ہو گیا تھا کہ محمد خان ترین کو سردست شکست دینا ممکن نہیں، سو اس نے محمد خان ترین کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا کر، ان کی جاگیر انھیں واپس دے دی تھی لیکن ہری سنگھ نے جنگ گندگر کی پرخاش کی وجہ سے ان کی جاگیر کے کچھ گاؤں واپس نہیں کیے، جس کی وجہ سے میدان جنگ دوبارہ سج گیا۔ جب یہ لڑائی ذاتی دشمنی میں بدلی تو رنجیت سنگھ دوبارہ ہزارہ آیا اور محمد خان ترین کو دوست بنا کر لاہور لے گیا۔ جب وہ وہاں سے واپس آنے لگے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

ہری سنگھ چاہتا تھا کہ وہ محمد خان ترین کو خود اذیت ناک موت سے دو چار کرے، سو اس نے والی سلطنت لاہور سے درخواست کی کہ وہ ترین کو میرے حوالے کرے۔ رنجیت سنگھ نے انکار کیا تو اس نے پیش کش کی کہ وہ اس کے بدلے اسے پچپن ہزار روپے ادا کرے گا؛ یوں اس نے انھیں رنجیت سنگھ سے پچپن ہزار میں خرید کر یہاں سے سیکڑوں میل دور ملک کلر کہار کے قلعے میں بند کر دیا اور محافظوں کو ہدایت دی کہ وہ انھیں تیز نمک ملی ہوئی روٹی کے سوا کچھ بھی کھانے کو نہ دیں اور روٹی کے بعد چھ گھنٹے تک انھیں پیاسا رکھیں۔ یہ سلسلہ دو ماہ تک چلتا رہا اور ایک دن جب محافظ انھیں پانی دینے گئے تو شدت پیاس سے ان کا کلیجہ پھٹ چکا تھا اور ان کے منہ سے نکلا ہوا خون ان کی داڑھی پر جمے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔''

❁

محمد خان ترین کی شدت تشنگی سے مرنے کی یہ اذیت ناک کہانی، جسے میں نے اپنے بچپن میں درجنوں بار سنا اور بابا کے نوشتے میں سیکڑوں بار پڑھا، مجھے جب بھی یاد آتی ہے، میرا خوف اور پیاس سے

دم گھٹنے لگتا ہے اور میں بے اختیار اٹھ کر پانی کی طرف بھاگتا ہوں۔

جنگ ناڑہ میں ہمارے قبیلے کی فتح کے بعد سکھوں کی گرفت پورے خطے پر ڈھیلی پڑنا شروع ہوگئی، جس سے فائدہ اٹھا کر غلام خان ترین نے، جو اس وقت جوان تھے، میدان ہزارہ میں سکھوں کے قلعوں پر پوری تیاری کے ساتھ حملے کیے اور اپنے تمام مقبوضہ علاقے چھڑا لیے۔ ان کی فتح کی خبر جب ہماری بستی میں پہنچی تو بابا اور بڑے چچا انھیں مبارک باد دینے گئے تھے، میں اور عبدل چچا بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ یہ دارالعلم مانگل میں، میرے داخلے سے ایک سال پہلے کی بات ہے اور میری عمر اس وقت نو سال کے لگ بھگ تھی۔

یہ میرا کسی بھی میدانی علاقے کی طرف پہلا سفر تھا؛ جس کی وجہ سے میں بہت پُر جوش تھا۔ بابا اور چچا اپنے اپنے گھوڑوں پر تھے اور عبدل چچا خچر پر۔ بستی سے لے کر میدانی علاقہ شروع ہونے تک کا سفر میں نے عبدل چچا کے ساتھ خچر پر، میدانی علاقے سے بڑی سڑک تک کا سفر، چچا کے گھوڑے پر اور وہاں سے آگے کا سفر میں نے بابا کے ساتھ ان کے گھوڑے پر بیٹھ کر کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بڑی سڑک کے کنارے، اپنے گھوڑے پر بٹھاتے ہوئے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سڑک کشمیر سے شروع ہو کر، مانگل سے ہوتی ہوئی یہاں؛ اور پھر یہاں سے براستہ حسن ابدال پنڈی جاتی ہے؛ اب ہمارا اگلا سفر اسی سڑک پر ہے۔

اس کشادہ سڑک پر ہماری سواریاں سرپٹ بھاگ رہی تھیں اور ان کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی؛ یہ ایسا رستہ تھا جس پر اور بھی بہت سے لوگ آجا رہے تھے، کچھ پیدل، کچھ گھوڑوں اور خچروں پر اور کچھ تانگوں پر۔ تانگہ میں نے پہلی بار دیکھا۔ ہم نے اس سڑک پر میل بھر کا سفر ہی طے کیا تھا کہ آگے سے ایک سست رفتار قافلہ آرہا تھا جو سامان سے لدی بیل گاڑیوں اور چھکڑوں پر مشتمل تھا۔ ہم اس قافلے کو رستہ دینے کے لیے ایک طرف رک گئے تاکہ وہ گزر سکے۔ ''یہ لوگ مانگل، پکھلی اور دوسرے علاقوں میں سامان لے کر جا رہے ہیں۔'' بابا نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میرے لیے یہ بہت انوکھی بات تھی، ہمارے علاقے میں زیادہ تر سامان سروں پر ہی ڈھویا جاتا تھا کچھ ہی لوگوں کے پاس اس کام

کے لیے ہماری طرح گدھے اور خچر تھے۔

چند میل مزید چلنے کے بعد ہم بڑی سڑک سے بائیں طرف مڑ گئے تھے جہاں سے مکانوں کی ایک لمبی قطار شروع ہوگئی تھی۔ یہ مکان، ہماری بستی کے مکانوں سے زیادہ چوڑے اور کشادہ تھے ان میں سے کچھ دومنزلہ بھی تھے؛ یہ ایک بڑا گاؤں تھا، ہمارے گاؤں سے کہیں بڑا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی کئی لوگوں نے بابا کو سلام کیا تھا۔ بابا اور چچا نے بھی رک کر ان کی خیر خیرت دریافت کی۔ ایک چوک سے ہم جوں ہی دائیں جانب مڑے ایک لمبی دیوار شروع ہوگئی تھی۔ میں ان دنوں اتنی لمبی دیوار کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، یہ دیوار ہمارے آدھے گاؤں جتنی لمبی تھی؛ جہاں تک نظر جاتی تھی دیوار ہی نظر آتی تھی۔ دیوار کے عین وسط میں پہنچ کر ہم ایک دیو قامت دروازے کے سامنے ہم رک گئے۔ یہ دروازہ اتنا بلند تھا کہ میری جسامت کے تین آدمی بھی ایک دوسرے پر کھڑے ہو جائیں تو وہ اس کے اوپر والے سرے تک نہ پہنچ پائیں۔ کچھ لوگ تلواریں ہاتھ میں لیے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے؛ ان میں سے ایک نے بابا سے، ان کا نام پوچھا تھا۔ بابا کا جواب سنتے ہی انھوں نے دروازہ کھول دیا اور ہم اپنی سواریوں سمیت اندر داخل ہو گئے تھے۔

اندر جا کر دیکھا تو نقشہ ہی اور تھا؛ چار دیواری کے اندر ایک پورا گاؤں آباد تھا، جس میں کئی عالی شان مکان تھے۔ اردگرد کھیت تھے، جن میں سے کچھ میں گندم اور جو لہلہا رہے تھے تو کچھ میں باغات؛ باغات میں قطار در قطار مختلف اقسام کے پھل دار درخت لگے ہوئے تھے جن پر کونپلیں پھوٹی ہوئی تھیں۔

ہم کھیتوں اور باغوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک شاندار حویلی کے دروازے پر رکے۔ دو تین لوگ آگے بڑھے اور انھوں نے ہماری سواریوں کی باگیں سنبھال لیں، ہم اترے اور وہ ہمارے گھوڑے اور خچر لے کر ایک طرف چلے گئے۔

ہمیں ایک مہمان خانے میں لے جایا گیا، جس کا فرنیچر اور دیگر ساز و سامان بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ بستی میں سب سے بڑا مہمان خانہ ہمارا ہی تھا اور میں جب اس کا موازنہ بستی کے دوسرے مہمان خانوں سے کرتا تو مجھے فخر کا احساس ہوتا تھا لیکن یہاں کا مہمان خانہ دیکھ کر تو مجھے یوں لگا جیسے ہم

ڈنگروں کے کسی باڑے میں رہ رہے ہیں۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے دروازے سے، جو اس حویلی کے اندر کی طرف کھلتا تھا، ایک جواں سال شخص، جس کا لباس ہمارے لباس سے کہیں زیادہ قیمتی تھا، اندر داخل ہوا، جس کی پتلی پتلی مونچھیں تھی اور ڈاڑھی مونڈی ہوئی تھی۔ اس نے جو پگڑی پہنی ہوئی تھی وہ ہمارے علاقے کی پگڑیوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ پہلے بابا سے گلے ملا پھر چچا سے؛ عبدل چچا اور مجھ سے اس نے صرف ہاتھ ملایا۔

یہ غلام خان ترین سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد میری ان سے صرف دو ملاقاتیں ہوئی تھیں ایک دفعہ حسن علی خان کے بیٹے آزاد خان کی شادی پر اور دوسری دفعہ مری کی جنگ شروع ہونے سے پہلے، جب بابا نے عبدل چچا کے ہاتھ انھیں ایک خچر کا تحفہ دے کر بھیجا تھا اور میں اسی خچر پر بیٹھ کر گیا تھا اور واپسی پر عبدل چچا کے گھوڑے پر۔ غلام خان ترین نے جواباً بابا کے لیے ایک تلوار کا تحفہ بھجوایا تھا۔

اس واقعے کے تقریباً گیارہ سال بعد، میں اپنا سب کچھ لٹ لٹا کر، اسی شاندار حویلی میں بیٹھا تھا کہ غلام خان ترین نے؛ جنھوں نے اس مشکل وقت میں مجھے ہر طرح سے سنبھالا دیا اور میرا اتنا خیال رکھا تھا کہ شاید کوئی سگا بھی نہ رکھ سکتا، مجھے اطلاع دی کہ مری کے حملے کی مخبری کسی ناظم خان نامی شخص نے کی تھی، جو لیڈی لارنس کا ذاتی ملازم تھا، ورنہ آج صورت حال مختلف ہوتی۔

میں یہ نام سن کر چونکا تو ضرور تھا لیکن کسی فوری ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ میں اسے جانتا ہوں تو انھیں شک ہو جائے گا کہ میں اس کی تلاش میں یہاں سے نکل جاؤں گا اور وہ میری نگرانی شروع کر دیں گے، جس طرح انھوں نے بستی جلائے جانے کے بعد اس وقت تک مجھ پر کڑی نظر رکھوائی جب تک میرے جذبات کسی حد تک ٹھنڈے نہیں ہو گئے۔

انھیں یہ خبر ایبٹ آباد کے کسی دوست نے دی تھی، جس کا ایک عزیز ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں منشی تھا؛ انھیں بتایا گیا تھا کہ سرکار نے اسے اس کے صلے میں گراں قدر انعام سے نوازا ہے۔

ناظم خان کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں بجائے کسی انسانی شباہت کے،کوہِ دناہ کے دامن میں واقع ،اس بستی کا نقشہ ابھرا تھا، جہاں میں پہلی دفعہ چچا کے ساتھ اور دوسری دفعہ باز خان تک حسن علی خان کا پیغام پہنچانے اکیلے گیا تھا۔میں نے فوراًاندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا گھر اسی بستی کے کسی محلے میں ہوگا، جہاں باز خان اپنے کسی عزیز کے ہاں ٹھہرے تھے۔

اس رات جب میں غلام خان ترین کے پاس سے اٹھ کر اُس کمرے میں گیا، جو انھوں نے میری رہائش کے لیے مختص کر رکھا تھا،اور جہاں انھوں نے مجھے زندگی کی ہر وہ آسائش بہم پہنچائی تھی، جس کا میں تصور کر سکتا تھا،تو میرا وجود غصے سے کانپنے لگا۔میرے دل میں لگے وہ سارے زخم جو آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے، دوبارہ تازہ ہو گئے۔میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے اپنا دل،خون کے بجائے پیپ کا لوتھڑا نظر آیا اور اس سے بدبو کے ایسے بھبھوکے اٹھے کہ مجھے اپنے پورے وجود سے گھن سی آنے لگی۔ میں کافی دیر،اس بدبو سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن اس وقت تک ایسا ممکن نہیں ہو سکا تھا، جب تک میں نے وہاں سے روانگی کا فیصلہ نہیں کر لیا۔

❁

میں رات کے پچھلے پہر اٹھا، پہلے باہر جا کر ارد گرد کا جائزہ لیا، جب مجھے تسلی ہوگئی کہ سب لوگ سو چکے ہیں تو میں نے بابا کی پگڑی کو چوما اور تلوار کو نیام سے نکال کر اس کی دھار پر ہاتھ پھیرا۔پھر تلوار کو ایک طرف رکھ کر،ٹوپی سر پر رکھی اور اس کے گرد لٹھے کی بوسیدہ چادر اسی طرح باندھی، جس طرح بابا نے آخری محاذ جنگ پر جانے سے پہلے میرے سر پر باندھی تھی اور تلوار کو واپس میان میں رکھ کر اسے گردن میں حمائل کیا۔نوشتہ اٹھایا اور اس کو اسی تھیلے میں ڈالا، جس میں عبدل چچا اسے لے کر میں پاس آئے تھے؛ تھیلے کو بغل میں دابا اور دبے قدموں چلتا ہوا ،غلام خان کی حویلی سے نکل گیا،میرا رخ گڑھی کے مرکزی دروازے کے بجائے الٹی طرف تھا، جہاں دیوار کے ساتھ درختوں کا جھنڈ تھا۔وہاں پہنچ کر میں نے پگڑی اتار کر نوشتے والے تھیلے میں ڈالی تھیلا کندھے سے لٹکایا اور ایک درخت پر چڑھنے لگا، جس کا ایک ڈال دیوار سے باہر کی طرف پھیلا ہوا تھا اور ڈال سے لٹک کر دیوار کے باہر کی طرف کود گیا اور ڈبران کی طرف

جانے والے راستے پر ہولیا۔

جب سورج طلوع ہوا تو میں کوہ ڈبران اور کوہ ناڑہ کے درمیان بہنے والی ندی میں اتر چکا تھا، جہاں میں کچھ دیر سستانے کے لیے رکا۔ میں اس علاقے میں، اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا، سو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس راستے پر چلتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہوں۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا، اس بارے میں سوچ بچار کرتا رہا اور بے خیالی میں کنکر اٹھا اٹھا کر ندی کے پانی میں پھینکتا رہا، جو میری پرانی عادت تھی۔ جب ایک بڑا پتھر ندی میں بنی ڈھن میں گرا اور پانی کی سطح پر دائرے سے بننے لگے تو انھیں دیکھتے ہوئے مجھے اپنا رستہ بھی سجھائی دے گیا۔

''یہ ندی کہیں نہ کہیں تو جا کر دریائے ہرو میں گرتی ہوگی۔'' یہ خیال آتے ہی میں نے تھیلا کاندھے سے لٹکایا اور ندی کو خضر راہ کیے، اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، ندی کا پانی بھی میری رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا کہ ارد گرد کے چشموں کا پانی بھی اس میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔

دوپہر کے وقت جب میں ہرو میں اترا اور میں نے دریا کے الٹے بہاؤ کی طرف سفر شروع کیا تو میل بھر چلنے کے بعد یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میں دوتارہ کے اس مقام پر پہنچ چکا ہوں، جہاں ہرو کی دونوں شاخیں آپس میں ملتی ہیں۔ یہ وہی جگہ تھی، جہاں میں چھوٹے چچا کے ساتھ کوہِ دناہ کی طرف جاتے ہوئے بہاؤ کے الٹی سمت مڑا تھا۔

جب میں اس جندر پر پہنچا، جس پر چچا کے ساتھ کوہ دناہ کی طرف جاتے ہوئے، ہم رکے تھے تو سورج ڈھلنے کے قریب تھا۔ میں وہاں سستانے کے لیے رکا۔ جندروئی نے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا ؛ میں نے بھی جواباً ہاتھ جوڑ کر اسے سلام کا جواب دیا۔ اس نے میرے تھکے ہارے چہرے اور پھر میرے کاندھے سے لٹکے بے ڈھنگے تھیلے کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو تو میرے منہ سے بے اختیار بگڑہ کا نام نکلا۔ یک دم مجھے یاد آیا کہ آٹھ نو ماہ پہلے جب میں چچا کے ساتھ دناہ کی وادی کی طرف جاتے ہوئے یہاں رکا تھا اور اسی شخص نے ان سے پوچھا تھا کہ کہاں سے آرہے ہیں تو انھوں نے

بھی بگڑہ کا نام لیا تھا۔

بگڑہ کا نام سنتے ہی اس شخص نے میرے چہرے کی طرف دوبارہ غور سے دیکھا، اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ذہن پر زور ڈال کر، اپنی یادداشت کو کھنگالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں نے خود ہی اسے بتا دیا کہ میں پچھلی گرمیوں میں اپنے چچا کے ساتھ دناہ جاتے ہوئے یہاں رکا تھا اور آپ نے تازہ لسی سے ہماری تواضع کی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ وہاں کے فلاں آدمی کو جانتے ہو تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا؛ لیکن اس کے باوجود ہوا وہی، جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ اس نے بگڑہ کے کسی ہندو کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے ہوشیاری سے جھوٹ بول دیا کہ ہاں میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میرے اُس چچا کے بہت اچھے دوست ہیں، جن کے ساتھ میں پچھلی مرتبہ یہاں آیا تھا اور لسی پی تھی۔

تازہ لسی کے ذکر سے اُس کا دھیان فوری طور پر کھانے کی طرف گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ رستے میں کھانا کھایا ہے، میرے نفی میں سر ہلانے پر، اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمودار ہوئے، اسے اندازہ ہو گیا کہ میں بھوکا ہوں۔ وہ فوراً اندر گیا، جب واپس آیا تو وہ آٹے سے اٹے ہوئے اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا، مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جندر کے پاٹوں کے آگے لگی ہوئی آٹے کی تہہ ہٹانے گیا تھا۔

''تم تھوڑی دیر بعد پاٹوں کے آگے سے آٹے کی تہہ ہٹا دینا۔'' اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ میں گھر جا کر کھانا لے آتا ہوں؛ دونوں کھائیں گے اور ہاں اب آگے کا سفر صبح کرنا، اس وقت جانا مناسب نہیں، میرے پاس اضافی چارپائی موجود ہے۔'' اس نے چارپائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں نے جانا ہے۔'' میں نے مصنوعی اصرار کیا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ یہ کون سا وقت ہے۔ جس سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوئی کہ چلو رات گزارنے کے لیے کوئی ٹھکانہ تو ملا۔

گھنٹے بھر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں جو کی روٹی اور دوسرے میں

پھگواڑی کا ساگ تھا جسے گھی سے تڑ کا لگا یا گیا تھا۔وہ ہانڈی ہی ساتھ اٹھالایا تھا تا کہ اسے دوبارہ گرم نہ کرنا پڑے۔جوں ہی اس نے ہانڈی سے چھوٹی اٹھائی اور ساگ کی خوشبو نے میرے نتھنوں کو چھوا،میری اشتہا مزید بڑھ گئی۔

میں نے عجلت میں نوالہ توڑا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ میں بہت بھوکا ہوں اس لیے اس نے اپنے کھانے کی رفتار کم رکھی تا کہ میں زیادہ سے زیادہ کھا سکوں۔میں روٹی کا آخری نوالہ بھی ہڑپ کرنے والا تھا کہ یک دم مجھے خیال آیا کہ ایک آدھ نوالہ چھوڑ دینا چاہیے تا کہ مہمانی کے آداب پر حرف نہ آئے سو میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے جندر کے پاٹوں کے آگے پڑا آٹا سمیٹ کر ایک بوری میں ڈالا اور ایک بھاری چونگ جندر کے کھارے میں انڈیلی اور میری چارپائی کے سامنے بچھے کھٹولے پر دراز ہوگیا۔اس نے مجھے بتایا کہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی مسافر کا منتظر رہتا ہوں۔جس دن کوئی مہمان یہاں ٹھہرے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ گپ شپ میں رات کٹ جاتی ہے ورنہ مجھے تنہائی ڈستی رہتی ہے،اس نے کہا کہ لوگ کہتے تو ہیں کہ جندر کی رات بہت بھاری ہوتی ہے لیکن تم جیسے لوگ اس کا ادراک نہیں کر سکتے،جو مہمان کے طور پر کسی جندر میں ٹھہرتے ہیں،جہاں اس کا میزبان یعنی جندروئی پہلے سے موجود ہوتا ہے،اس کا ادراک مجھ جیسا کوئی شخص ہی کر سکتا ہے جو سال کی تین سو پچاس سے زائد راتیں اکیلے گزارتا ہے اور صرف چند راتوں میں اسے کوئی ہم زاد میسر آتا ہے۔

میں نے رات کو جندر کی رکھوالی کے لیے کئی بار ملازم رکھے لیکن ایک دو کو چھوڑ کر،کوئی بھی شخص ایک مہینے سے زیادہ یہاں نہیں ٹکا۔مہینہ بھی اس لیے کہ ملازم رکھتے ہوئے میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ اگر تم نے مہینہ مکمل ہونے سے پہلے چھٹی کی تو میں تمھیں تنخواہ نہیں دوں گا۔

پھر اس نے،مجھے جندروئیوں کی بہت سی کہانیاں سنائیں،جن میں سے زیادہ تر مجھے مافوق الفطرت لگیں۔مجھے ان مافوق الفطرت کہانیوں سے زیادہ،وہ جنگی کہانیاں بھاتی تھیں،جن میں مبالغے کے باوجود حقیقت کا رنگ زیادہ گہرا ہوتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس کی کہانیوں کے درمیان ہی

سوگیا اور نیند ہی میں ہاں ہوں کرتا رہا۔ اسے احساس تو تھا کہ مجھ پر نیند کا غلبہ ہے لیکن ایک عرصے کے بعد اسے کوئی ایسا شخص میسر آیا تھا، جسے وہ جندرو ئیوں کی کہانیاں سنا سکے، سو اس نے کہانیاں سنانا جاری رکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس کی کہانیاں اور میرے خواب آپس میں اتنے گتھم گتھا تھے کہ صبح جب میں جاگا تو میں ان کہانیوں کو، اس رات دیکھے ہوئے خوابوں سے جدا نہیں کر سکا۔

جب میری آنکھ کھلی تو جندر بدستور چل رہا تھا لیکن وہ غائب تھا۔ میں کافی دیر تک اس کی سنائی ہوئی کہانیوں کو اپنے دیکھے ہوئے خوابوں سے جدا کرنے کی کوشش کرتا رہا؛ یہاں تک کہ وہ ایک ہاتھ میں چنگیر اور دوسرے میں لسی کی گھڑولی لیے دروازے سے داخل ہوا۔ ہم نے لسی کے ساتھ مکئی کی باسی روٹی کھائی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، تھیلے سے بابا کی تلوار نکالی، یہ کہہ کر، اسے امانتاً سونپی کہ ایک دو روز میں جب میری واپسی ہوگی تو لے لوں گا، اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا، جو زیادہ دور نہیں تھی۔

سولہ

دناہ کی وادی میں، اپنے ورود کے اڑتالیسویں دن، میں ناظم خان کو سرکار کی طرف سے اسے دی گئی اعزازی شمشیر کے ساتھ قتل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے دوسرے ہی دن، اس کے گھر کا پتہ لگا لیا تھا کہ سرکار کی طرف سے انعام ملنے کے بعد، اب وہ علاقے کا ایک مشہور آدمی بن چکا تھا۔

سرکار نے اسے زمین کا ایک بڑا قطعہ اراضی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ، سواری کے لیے ایک گھوڑی اور ایک اعزازی شمشیر بھی دی تھی۔ اس نے اپنے ایک عزیز کو اپنا محافظ بھی رکھ لیا تھا، جس کے کندھے کے ساتھ ہر وقت ایک توڑے دار بندوق لٹکی رہتی تھی، تاکہ لوگوں پر اس کا رعب اور دبدبہ قائم رہے اور باغیوں کے عزیزوں اور رشتے داروں میں سے کوئی شخص اُسے گزند نہ پہنچا سکے، اگر چہ اس کے آثار بہت کم تھے کہ مری میں بائیس لوگوں کو توپوں سے اڑائے جانے اور بقیہ کو گرفتار کر لینے کے بعد علاقے میں ایک سراسیمگی کی سی کیفیت تھی۔

لوگ اگر چہ اس سے دلی طور پر نفرت کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے اس کے خلاف باتیں بھی کرتے تھے، لیکن جب وہ ان کے سامنے سے گزرتا، اسے ادب سے سلام کرتے کہ مبادا وہ انگریز سرکار کو شکایت لگا دے اور ہماری شامت آجائے۔

میں اگر چاہتا تو، اگلے دو چار ہی دنوں میں، گھات لگا کر، اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا؛ لیکن اچانک حملے کی صورت میں، میں اس کی آنکھوں میں موت کے وہ سائے نہیں دیکھ سکتا تھا، جو کسی شخص کی آنکھوں میں، اس وقت لہراتے ہیں جب اسے یقین ہو کہ اب کچھ ہی لمحوں میں، اس نے ہر حال

میں موت کے گھاٹ اتر جانا ہے۔

اپنے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے، کوئی ایسی جائے وقوعہ منتخب کرنا، میرے لیے ضروری تھا، جہاں اسے مجھ سے بچانے والا کوئی نہ ہو اور میں کچھ دیر اس کی آنکھوں میں لرزاں، موت کے سائے دیکھ سکوں۔

میں نے پہلی رات ایک مسجد میں گزاری تھی، جو اس محلے سے خاصی ہٹ کر تھی جہاں میری سوتیلی ماں کا خاندان رہتا تھا۔ اس بات کی خبر تو مجھے مل چکی تھی کہ دونوں ماموؤں کو، جو کہنے کو تو سوتیلے تھے لیکن انھوں نے مجھے اپنے سگے ماموؤں سے زیادہ پیار دیا، بابا کے ساتھ توپ سے اڑایا جا چکا ہے لیکن ان کے بیوی بچوں اور خاندان کے دوسرے افراد کے بارے میں، مجھے یہیں آ کر پتہ چلا کہ اُن کے گھر جلا دیے جانے کے بعد وہ، یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔

میں نے چوں کہ اب تک کی اپنی زندگی کا نصف کے قریب حصہ گھر اور بستی سے دور مانگل کے مکتب میں گزارا تھا اور میں زندگی میں صرف چار مرتبہ یہاں، اپنے ننھیالی گاؤں آیا تھا، اس لیے اُس رات مسجد میں داخل ہوتے وقت مجھے تسلی تھی کہ مجھے یہاں کوئی نہیں پہچانے گا؛ لیکن صبح جب جماعت کھڑی ہوئی تو میں نے وہاں ایک ایسے شخص کو بھی نماز پڑھتے دیکھ لیا، جو جنگ ناڑہ کے زمانے میں ہمارے ڈیرے پر کافی دن ٹھہرا رہا تھا اور اب اس کی ڈاڑھی سفید ہو چکی تھی۔ میں اس سے نظریں بچا کر وہاں سے نکل آیا اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ یہاں قیام مناسب نہیں۔

میں دن بھر آبادی کے اردگرد پھیلے راستوں میں گھومتا پھرتا رہا؛ جہاں بھی مجھے کوئی ویران جگہ نظر آتی میری خواہش ہوتی کہ کاش کبھی اس کا اور میرا سامنا یہاں ہو اور میں اس سے دو دو ہاتھ کر سکوں۔ میں بستی سے مغرب کی طرف جاتے، ایک ویران رستے پر چلتا ہوا کافی آگے نکل آیا۔ یہ رستہ آگے جا کر اسی رستے میں مل گیا تھا، جس سے میں گزشتہ روز گزرا تھا۔ یہ دوراہا اس جندر سے فرلانگ بھر کی دوری پر تھا، جہاں میں نے گزشتہ رات گزاری تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا، جندر پر گیا؛ جندر روئی، جندر کے ساتھ بنی کیاریوں میں لگی بھنڈیوں کی

گوڈی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے علیک سلیک کی اور کیاری میں داخل ہو کر گھاس پھونس اکھاڑنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اس نے مجھے منع کیا لیکن میں نے کہا کہ دوسروں کی مدد کرنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور ہمارا خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ وہ کافی دیر مجھے بھنڈی کے فوائد گنواتا رہا؛ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی بتایا کہ کچی بھنڈی کا لیس دار پانی جوڑوں کے درد کے ساتھ ساتھ قوت باہ کے لیے بھی بہت مفید ہوتا ہے، لیکن میرے ذہن میں، اس وقت، ناظم خان کو اس طریقے سے موت کے گھاٹ اتارنے کا سودا سمایا ہوا تھا کہ میں اس کی آنکھوں میں وہ اذیت بھرا منظر دیکھ سکوں، جو صرف اور صرف اس شخص کی آنکھوں میں ابھر سکتا ہے، جسے تھوڑی ہی دیر میں موت کے گھاٹ اترنے کا پورا یقین ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میرا یہاں مہینہ بھر قیام ضروری تھا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں اسی جندر کو، اپنا مستقل ٹھکانہ بنالوں۔

''میں آپ کے جندر پر مزدوری کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بے خیالی میں کہا۔

''تم نے وہ مقولہ نہیں سنا کہ جندر کی رات خدا کسی کو نہ دکھائے۔ اگر میں نے تمھیں ملازم رکھا تو تمھیں یہاں راتیں اکیلے گزارنا پڑیں گی۔'' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے انسانوں کے علاوہ کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ اگر تم مجھے ایک لمبے دستے والی چھوی اور ایک چاقو خرید دو تو میں رات کو تمھارا جندر چلا سکتا ہوں۔'' میں نے کیاری سے گھاس اکھاڑتے ہوئے کہا۔ اس نے میری طرف حیرانی سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

''ویسے کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔ انسان نے انسانوں پر جتنے ظلم ڈھائے ہیں کسی دوسری مخلوق نے نہیں ڈھائے؛ لوگ ہمیں ڈراتے تو بھوتوں، چڑیلوں اور گھوڑی ڈیچوں سے ہیں لیکن مارتے اپنے ہاتھوں سے ہیں۔''

جب ہم کیاری کی باڑھ پھلانگ کر جندر کے صحن میں داخل ہو رہے تھے تو ہمارے معاملات طے ہو چکے تھے۔ غروبِ آفتاب سے طلوعِ صبح تک جندر کی رکھوالی میں نے کرنا تھی اور دن کو اس نے۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ پہلی تین راتیں جندر پر میرے ساتھ رہے گا۔

میں نے پہلی ہی رات جندر کے سارے معمولات سمجھ لیے، آٹے کو باریک پیسنے کے لیے پاٹوں کے ساتھ لگی لکڑی کی کیل کو کیسے گرانا ہے، اگر موٹا دلنا ہے تو اوپر والا پاٹ، نچلے پاٹ سے مزید اوپر کیسے اٹھانا ہے۔ ایک من گندم پیسنے میں کتنا وقت لگتا ہے اور اتنی ہی مکئی پیستے ہوئے کتنا وقت زائد درکار ہوتا ہے۔ پاٹوں کے آگے لگنے والی آٹے کی تہہ کتنی دیر بعد ہٹانی ہے۔کسی وجہ سے اگر جندر بارنا پڑ جائے تو پانی کس طرح موڑنا ہے اور دوبارہ کیسے چلانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اگلی دو راتوں میں، میں نے یہ سارے کام اتنے بھرپور طریقے سے کیے کہ وہ خوش ہوگیا اور اس نے تین ماہ کے بعد مجھے کپڑوں کا ایک جوڑا اپنی طرف سے سلوا کر دینے کا اعلان کر دیا۔

صبح جب وہ آتا تو میں جندر کے ساتھ بنے کمرے میں سو جاتا۔ دوپہر کے قریب اٹھتا اور دو میل کے فاصلے پر موجود، اس محلے کی طرف نکل جاتا، جہاں ناظم خان کا گھر تھا۔ میں نے اگلے چار دن اس کھوج میں لگائے کہ اس کے زندگی کے معمولات کیا ہیں اور اس کا آنا جانا کہاں کہاں ہے۔

مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ سرکار کی طرف سے انعام کے طور پر دیے گئے قطعہ اراضی پر ایک شاندار مکان تعمیر کرنے کے منصوبے پر کام کر رہا ہے؛ یہ جگہ اس کے آبائی گھر سے مغرب کی طرف اور جندر سے جنوب مشرق کی طرف اسی اجاڑ رستے پر واقع تھی، جس پر چلتے ہوئے میں اس دن آیا تھا۔ میں ہر روز دن کے کھانے کے بعد اس طرف نکل جاتا تا کہ اس کے آنے جانے کے معمولات پر نظر رکھ سکوں نیز جائے وقوعے کا تعین کرنے میں بھی آسانی ہو۔

وہ تقریباً ہر روز ظہر کے وقت اپنے محافظ کے ساتھ وہاں آتا اور دن میں ہونے والے کام کی رفتار کا اندازہ لگاتا؛ اس کی واپسی عموماً نماز عصر کے فوراً بعد ہوتی تھی۔ اس کے گھر سے وہاں تک کا فاصلہ کم و بیش ایک میل تھا، اور درمیان میں ایک برساتی نالہ پڑتا تھا۔ نالے کے کنارے پر رستہ ایک ٹیلے کو درمیان سے چیرتے ہوئے گزرتا تھا۔ رستے کے دونوں کنارے اتنے اونچے تھے کہ وہاں سے اگر ہاتھی پر سوار ہو کر بھی گزرا جائے تو سوار کا سر کناروں کے اوپر والے سروں کو چھو نہیں سکتا تھا۔ ٹیلے کے ان کناروں پر گرنڈے اور سنتھے کی جھاڑیاں تھیں، جنھیں میں نے مچان کے طور استعمال کرنے کا منصوبہ تیار کیا

تھا۔میری خواہش تھی کہ میں اسے اسی تلوار سے قتل کروں، جو اسے اپنوں سے غداری کے صلے میں دی گئی تھی،اس لیے میرا پہلا نشانہ،اس کے بندوق بردار محافظ کو بننا تھا۔

اس دن، میں اس کی واپسی کے وقت سے تھوڑا پہلے، ٹیلے کے کنارے بیٹھ گیا تھا۔تقریباً ادھ پون گھنٹے بعد وہ مجھے اپنے محافظ کے ساتھ آتا دکھائی دیا؛ وہ خود سرکار کی طرف سے دی گئی گھوڑی پر جب کہ اس کا بندوق بردار محافظ اس کے پیچھے پیچھے خچر پر تھا۔انھیں دیکھتے ہی، میں جھاڑیاں کاٹنے میں مشغول ہو گیا تھا تاکہ وہ سمجھیں میں یہاں لکڑیاں کاٹنے آیا ہوں۔جب وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے اپنا دایاں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر انھیں سلام کیا اور مئودب انداز میں کھڑا ہو گیا۔وہ انگریزی طرز کا سلام دیکھ کر خوش ہوا اور اس نے ہامی بھرنے کے انداز میں گردن ہلا کر میرے سلام کا جواب دیا۔جوں ہی وہ میرے برابر سے گزرے میں نے چھوی کا ایک زوردار وار محافظ کی گردن پر کیا؛ وار اتنا کاری تھا کہ لمحوں میں اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور وہ خچر سے گر پڑا۔اس کے خچر سے گرتے ہی ناظم خان کی چیخ نکل گئی۔

میں نے چھوی پرے پھینکی اور اچھل کر خچر پر سوار ہو گیا۔اس سے پہلے کہ ناظم خان اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے تلوار کھینچتا، میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں اپنی سواریوں سے نیچے گر پڑے۔نیچے گرتے ہی میں نے اس کی تلوار کے قبضے پر اپنا ہاتھ جما لیا،اس نے چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن،وہ اڈھیر عمر شخص تھا اور میں بھرپور جوان۔میں نے اس کی گردن میں حمائل میان سے تلوار کھینچ لی۔تلوار میرے ہاتھ میں آتے ہی اس کا وجود تھرتھرانے لگا؛ اس نے لڑکھڑاتی زبان میں مجھ سے پوچھا : تم کون ہو اور مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟

جب میں نے اسے اپنے بابا کا نام بتایا تو وہ حسب توقع مزید سہم گیا اور میری حسب خواہش اس کی آنکھوں میں موت کے سائے لہرانے لگے۔

''بیٹے، تمھیں اپنے بہادر باپ کا واسطہ مجھے معاف کردو۔وہ بہت بہادر آدمی تھا۔جب اسے توپ کے آگے باندھ کر اس سے آخری خواہش پوچھی گئی تھی تو۔۔۔''میرے ہاتھ میں پکڑی تلوار، جو ہوا میں بلند تھی اور اگلے لمحے اس کے سینے میں اترنے والی تھی، وہیں ہوا میں معلق گئی۔

''تو۔۔''میں نے تلوار کی نوک زمین پر ٹیکتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ مجھے کھولیں اور دوبارہ توپ کے دہانے کے آگے اس طرح باندھیں کہ میرا منہ توپ کی طرف ہو؛ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اس کا سامنا کرنا چاہتا ہوں، لیکن انھوں نے اس کی یہ آخری خواہش یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ اس کے لیے ہمیں اعلیٰ حکام سے اجازت لینا پڑے گی اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔ مجھے اس وقت تمھارے باپ کی بہادری پر بہت رشک آیا؛ یہ رشک میں نے اس انگریز کے چہرے پر بھی دیکھا، جس نے تھوڑی دیر بعد ایک ساتھ بائیس توپیں داغنے کا حکم دیا تھا۔''

''تو پھر تم نے اپنوں سے غداری کیوں کی؟'' میں نے اس کی آنکھوں لہراتے موت کے پہلے سائے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا! میرا مخبری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خدا کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے مری سے فوجوں کے دلی جانے کی بات غلطی سے اپنی بیوی سے کر دی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس نے یہ بات میری بہو سے اور اس نے اپنی ماں سے کر دی، جہاں سے باز خان تک پہنچ گئی اور انھوں نے حملے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ حملے سے صرف تین دن پہلے میری بہن، جو دوسرے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی، مجھے ملنے آئی۔ اسے میرے بہنوئی نے ڈرایا تھا کہ اگر یہ بات انگریزوں تک پہنچ گئی کہ فوج کے دلی جانے کی خبر تمھارے بھائی کے ذریعے پھیلی ہے اور مقامی لوگوں نے مری میں فوج کی کمی کو دیکھتے ہوئے حملہ کیا ہے تو تمھارے بھائی کو توپ سے اڑا دیا جائے گا۔

میری بہن نے دوپٹہ میرے پاؤں میں پھینک کر مجھے واسطے دیے تھے کہ جا کر حکام کو بتا دو کہ حملہ ہونے والا ہے، اس سے تمھاری جان بھی بچ جائے گی اور سرکار تمھیں انعام بھی دے گی اور ہم سب کے دن پھر جائیں گے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے انعام کا کوئی لالچ نہیں تھا؛ مجھے تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ میں انگریزوں کے گھر کا ملازم تھا، میں انھیں جان گیا تھا، وہ بظاہر جتنے نرم خو اور مہربان ہیں اندر سے اتنے ہی سخت دل۔ اگر یہ بات نکل جاتی تو میری موت یقینی تھی، سو میں نے موت کے خوف سے یہ

مخبری کی تھی، جس پر میں آج تک شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے تمھارے بابا سمیت بے شمار لوگوں کی جان چلی گئی تھی، لیکن بیٹا مجھے مارنے سے اب وہ واپس تو نہیں آجائیں گے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ اپنے بہادر باپ کے صدقے میری جان بخش دو۔"

میں جو اس کی آنکھوں میں موت کا خوف دیکھنے کا متمنی تھا، اس کی آنکھوں میں موت کے لہراتے سایوں کا سامنا زیادہ دیر نہ کر سکا؛ اس کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور میں خود خوف زدہ ہو گیا تھا؛ میرے پاس اس خوف سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔

اس سے پہلے کہ میرے ہاتھ کانپنے لگتے، میں نے جلدی سے اس کے سینے میں، اسی سے چھینی ہوئی تلوار گھونپ دی۔ وہ لمحہ بھر کو تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ تلوار اس کی لاش پر پھینکتے ہوئے، میں نے ایک نظر، ابل کر باہر آچکی، اس کی آنکھوں پر ڈالی، موت کے لرزیدہ سائے وہیں منجمد ہو گئے تھے۔ میں نے جلدی سے، اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ انار دانے کے ادھ کٹے تنے کے پاس پڑی چھوی اور بابا کی بوسیدہ چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل آیا۔

سترہ

اس واقع کو گزرے آج انتالیس سال ہو چکے ہیں؛ لیکن چھ سال پہلے کی اس رات تک، جب میں نے عبدل کی مدد سے، جنگ ناڑہ کے سینتالیس سال بعد پہلی مرتبہ لواخ روشن کیا تھا، شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو، جس کے کسی لمحے میں، مجھے وہ لمحہ یاد نہ آیا ہو، جب میں نے ناظم خان کے سینے میں تلوار گھونپی تھی اور اس کی آنکھوں میں لرزیدہ موت کا سایہ، وہیں منجمد ہو کر میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔

انتالیس سال پہلے کی اس شام، جب میں اسے موت کے گھاٹ اتار کر، جندر پر پہنچا تو جندروئی نے میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے اندر کوئی غیر مرئی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اس کے پوچھنے پر، میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں، اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے بخار محسوس ہوا۔ ''تم جندر پر لگی چونگ دیکھنا، میں گھر سے بنفشے اور پودینے کا کاڑھا بنوا کر لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

میں تھوڑی دیر، جندر کے تھلے پر بیٹھا، اس منظر کو جھٹکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، جب کچھ سجھائی نہ دیا تو جندر کے ساتھ بنے کمرے میں گھسا؛ چھت کی کڑیوں میں اُڑسی تلوار اتاری، وہاں رکھا اپنا تھیلا اٹھایا اور دروازہ بھیڑ کر دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بخار کی وجہ سے مجھے چلنے میں دقت ہو رہی تھی لیکن جوں ہی میرے قدم سست پڑتے، ناظم خان کی آنکھوں میں منجمد سائے دوبارہ حرکت میں آجاتے اور میں پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ چلنا شروع کر دیتا۔

دوتارہ کے مقام سے کچھ پہلے؛ میں، بائیں طرف سے آ کر دریا میں شامل ہونے والی ایک

ندی کی طرف مڑ گیا اور میرا سفر، اُس ندی کے بہاؤ کے الٹ شروع ہوگیا۔ یہ ندی، ہرو کے برعکس خاصی تنگ تھی؛ اتنی تنگ کہ بعض جگہوں پر مجھے پانی کی ڈھنوں کے اندر چلنا پڑ رہا تھا اور کہیں کہیں تو میں کمر تک ڈوب جاتا، جس کی وجہ سے میرے کپڑے گیلے ہوگئے تھے اور مجھے ٹھنڈ لگنا شروع ہوگئی۔ ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد مجھے ایک جندر دکھائی دیا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک جندروئی باہر آیا، جو اپنے لباس اور ترشی ہوئی ڈاڑھی کے باعث، مجھے اپنا ہم مذہب لگا تھا۔

جندروئیوں کے لیے رات کے کسی بھی پہر کسی مسافر کی آمد کوئی انہونی بات نہیں ہوتی، اگر وہ جندر کسی معروف رستے پر ہو، لیکن یہ جندر کسی معروف رستے پر نہیں تھا لہٰذا جندروئی کے لیے، رات کے اس پہر کسی کی آمد غیر متوقع تھی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں رستہ بھٹک کر ادھر آ گیا ہوں تو اس نے مجھے جندر میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ بخار کی وجہ سے میرا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے مقدور بھر میری خدمت داری کی؛ اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ ندی نیلاں ہے اور یہاں سے تین چار میل کے فاصلے پر نیلاں بھوتو ہے، جہاں بری امام کی مشہور چلہ گاہ ہے۔

میں نے صبح کے وقت، بخار کے باوجود اجازت چاہی کہ یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں گرتا پڑتا تین ساڑھے تین گھنٹوں میں نیلاں بھوتو پہنچ گیا اور وہاں ندی کنارے ٹیلے پر بنے ایک مزار کے احاطے میں جا پڑا۔ مجھے شدید بخار نے آلیا، وہاں پڑے ایک دو ملنگوں نے مجھے کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھ کر میری خدمت داری شروع کر دی۔ وہیں ایک زائر نے، جس کا آبائی پیشہ حکمت تھا، مختلف جڑی بوٹیوں سے مرا علاج کیا۔ ٹھیک ہونے کے بعد، وہاں میرا دل لگ گیا اور میں نے کئی ماہ وہیں گزارے، جب سالانہ عرس شروع ہوا تو پہلی ڈالی بری امام سے آئی؛ دو دن بعد عرس کے اختتام پر میں انھی کے ساتھ نور پور شاہاں، بری امام کے دربار پر آ گیا اور زندگی کے اٹھائیس سال وہیں گزارے۔

نور پور میں میری آمد کے کچھ ہی دنوں بعد وہاں میری ملاقات ایک ہندو یاتری سے ہوئی، جو مزار پر حاضری دینے آیا تھا، مجھے ایک مسلمان صوفی کے مزار پر ایک ہندو عقیدت مند کی حاضری سے اچنبھا ہوا۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ مزار پر سلام کر کے پیچھے ہٹا اور ہماری نظریں آپس میں ٹکرائیں تو

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جب سانس لو۔ اس پر دھیان دو مجھے تم ڈرے ہوئے لگتے ہو۔'' مجھے لگا جیسے اس نے میری آنکھوں میں ناظم خان کی موت کے لرزاں سائے بھانپ لیے ہیں، میں خوف زدہ ہوگیا اور وہاں سے بھاگ گیا۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹا اور آنکھیں بند کیں تو معمول کے مطابق، میری آنکھوں میں حاکم کا چہرہ ابھرا، اسے جھٹکنے کی تگ و دو میں، اچانک مجھے اسی سادھو کی کہی ہوئی بات یاد آئی اور میں آنکھیں بند کر کے اپنا دھیان سانسوں کے اتار چڑھاؤ پر لگانے کی کوشش کرنے لگا؛ شروع میں مجھے مشکل پیش آئی لیکن جب میں نے سانسوں کی آواز پر کان دھرے تو میرا دھیان سانسوں کے شور میں کھو گیا تھوڑی سی مشق کے بعد مجھے سکون سا ملنے لگا اور میرے ذہن سے ناظم خان کا چہرہ غائب ہوگیا۔ میں نے یہ عمل اس وقت تک جاری رکھا جب تک میں نیند کی وادی میں نہیں اتر گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو میں خاصا پرسکون تھا، میں نے اندازہ لگایا کہ آج میں گہری نیند سویا ہوں۔ اس کے بعد، سونے سے پہلے سانسوں کی آمدورفت پر توجہ دینا میرا معمول بن گیا اور میں جب بھی لنگر لینے قطار میں کھڑا ہوتا، میری نظریں بے اختیار، اس شخص کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکنے لگ جاتیں۔

کئی دنوں کے بعد، ایک دن میں لنگر کے حصول کے لیے قطار میں کھڑا تھا کہ اچانک میری نظر اس پر پڑی؛ وہ لنگر حاصل کر چکا تھا اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھا، آرام آرام سے اور چبا چبا کر نوالے نگل رہا تھا۔ میں قطار چھوڑ کر سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا، جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں آپس میں مل کر پیتل کے تھال میں پڑے چاول سمیٹ رہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''لگتا ہے تم نے سانسوں پر دھیان لگانا شروع کر دیا۔''

''جی۔'' میں نے کہا۔ وہ خاموشی سے منہ میں پڑے چاول نگلتا رہا۔

''میں سکون کی تلاش میں ہوں۔ کوئی گُر بتائیے۔'' میں نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''یوگ سے جڑ جاؤ۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ مجھے یہ لفظ سنا سنا تو لگا، لیکن مجھے اس کے

بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔

''کیسے۔'' میں نے سوال کیا۔

''کل سویرے یہیں ملنا۔دونوں چلیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور احاطے سے باہر جانے والے راستے پر چل دیا۔میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔جب وہ احاطے سے باہر نکل کر، جنگل کی طرف جانے والے راستے پر مڑنے لگا تو میں نے اس سے نام پوچھا۔

''پرکاش۔'' اس نے کہا اور بائیں طرف مڑ گیا۔میں واپس آ کر قطار میں کھڑا ہوگیا اور اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

اگلے دن میں پو پھٹنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور اُس کا انتظار کرنے لگا۔کچھ ہی دیر میں وہ بھی وہاں پہنچ گیا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔میں نے لنگر کی قطار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے نفی میں گردن ہلائی اور مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا کہا۔

''یوگ۔خالی پیٹ کرنا چاہیے۔'' اس نے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹے ہموار قطعے میں اپنے کاندھے سے لٹکا تھیلا اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''میں جو جو کرتا جاؤں۔خاموشی سے میری نقل کرنا۔اپنا دھیان سانس کے اتار چڑھاؤ پر رکھنا۔''
یہ کہہ کر پہلے وہ گھاس پر التی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لینے لگا؛ میں بھی اس کی نقل کرنے لگا۔

خاصی دیر کے بعد، جب مجھے اپنی سانسوں کا شور پہلے سے زیادہ سنائی دے رہا تھا، اس کی آواز نے مجھے چونکایا۔میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ دونوں بازو ایک دوسرے کی سیدھ میں کھولے کھڑا تھا اور آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لے رہا تھا۔میں نے بھی اس کی پیروی کی۔جب میرے بازو تھکنے لگے تو اس کی آواز آئی۔

''بس بہت ہے۔باقی کل۔کل اسی وقت یہاں آجانا۔''

ہم واپس آئے تو لنگر ختم ہونے کے قریب تھا، جلدی جلدی قطار میں کھڑا ہو گئے۔

اس کے بعد وہاں جانا میرا معمول بن گیا۔ تین چار دن تک وہی یہیں مشقیں چلتی رہیں پھر اس نے مزید مشقیں شروع کیں تو مجھے پتہ چلا کہ یہ اسی طرح کی ورزشیں ہیں جو ہمارے علاقے کے جنگجو جنگ کی تیاری سے پہلے کیا کرتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ کسی خاص ترتیب میں نہیں تھیں اور یہ کہ اس میں آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور سانسوں کے اتار چڑھاؤ پر دھیان نہیں دینا پڑتا تھا۔

کچھ دنوں بعد وہ غائب ہوگیا؛ میں کئی دنوں تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ ایک دو دفعہ ارد گرد کے جنگل میں بھی تلاش کیا لیکن وہ نہ ملا تو مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ میں بہت عرصے تک یہ مشقیں کرتا رہا؛ ایک دن میں وہاں آلتی پالتی مارے اپنی سانسوں کا شور سن رہا تھا کہ مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہاں ایک نورانی چہرے والے بزرگ کھڑے تھے۔ انھوں نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے مجھ سے نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو کہنے لگے۔

''بیٹا۔ یہ سکون حاصل کرنے کا ہندوانہ طریقہ ہے۔ تمھیں مراقبہ کرنا چاہیے۔''

اگلے روز وہ مجھے ساتھ لے کر بری امام سرکار کی مشہور چلہ گاہ لوہے دندی کی طرف چل پڑے، چلہ گاہ کے نیچے موجود کٹھے کے ساتھ ساتھ چلتے ہم ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہو گئے، جہاں دن کے وقت بھی شام کا سا سماں تھا۔ وہاں ایک بڑی چٹان پر پہنچ کر انھوں نے خود بھی جوتے اتارے اور مجھے بھی جوتے اتارنے کا کہا۔ اس کے بعد انھوں نے حکم دیا۔ ''آلتی پالتی مار کر جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ جاؤ اور اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی تمام تر توجہ سانس لینے اور خارج کرنے پر مرکوز کرلو۔'' مجھے یہ بالکل وہی طریقہ لگا، جو پرکاش سادھو نے مجھے بتایا تھا۔ میں اسی طرح بیٹھ گیا اور اپنی توجہ سانسوں کے اتار چڑھاؤ پر مبذول کر لی؛ ساتھ ہی یہ بھی سوچنے لگا کہ یہ تو عین وہی طریقہ ہے پھر وہ ہندوانہ اور یہ مومنانہ کیسے ہوگیا۔ اچانک ان کی آواز ابھری۔

''اب آہستہ آہستہ ساری توجہ اپنے جسم کی طرف موڑو۔ اپنے پاؤں کی انگلیوں کے ناخن سے آغاز کرو۔ پھر ٹخنوں کی طرف؛ وہاں سے پنڈلی، گھٹنے، پھر اپنی رانوں اور پیٹ سے ہوتے ہوئے سینے کی طرف آؤ اور وہاں رک کر ساری توجہ دل کی دھڑکن پر لگا دو۔'' انھوں نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں

کہہ دیں۔وہ خاموش ہوئے تو میں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔میں نے اپنا دھیان پاؤں کے انگوٹھے سے شروع کیا اور انگوٹھے ہی میں پھنس گیا، جہاں کچھ دن پہلے مجھے چوٹ لگی تھی۔میں نے وہاں سے توجہ ہٹا کر براہ راست گھٹنے پر مرکوز کی اور پھر آ کے اپنی رانوں میں پھنس گیا اور میری یادداشت میں یک دم حاجرہ بی بی کا چہرہ ابھرا؛ اپنے واضح خدوخال کے ساتھ۔ناظم خان کے قتل کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ حاجرہ بی بی اپنے سارے نین نقش کے ساتھ میرے ذہن میں ابھری تھی۔

میں حاجرہ بی بی کے خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ باباجی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''دھڑکن کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

''نہیں۔میں ارتکاز نہیں کر پا رہا۔'' میں ہڑبڑا سا گیا تھا۔

''اگر دل پر توجہ نہیں ہو پا رہی تو پھر اپنا دھیان اوپر گردن کی طرف لے جاؤ۔پھر ٹھوڑی، ہونٹ، گال، ناک اور کانوں کو علاحدہ علاحدہ سے محسوس کرو؛ اور پھر پیشانی سے ہوتے ہوئے سر کے پچھلے حصے کی طرف جاؤ اور ساری توجہ ذہن پر مرکوز کر کے گہرے گہرے سانس لو۔'' انھوں نے اگلا ہدایات نامہ جاری کر دیا۔

میں نے جب اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو میرے ذہن میں اپنے خدوخال ابھرنے کے بجائے حاجرہ بی بی کی گردن، ہونٹ، ناک، کان اور چوڑی سی پیشانی ابھری اور مجھے بے حد سکون ملنے لگا۔

''ارتکاز ہوا۔'' کچھ ہی دیر میں باباجی کی آواز سنائی دی۔

''جی۔ہو رہا ہے۔'' میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا میں حاجرہ بی بی کے خدوخال میں پوری طرح منہمک تھا۔

وہ مطمئن ہو گئے۔

اٹھارہ

دارالعلم مانگل میں میرا یہ چوتھا سال تھا اور میری عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔

یہ سرما کی ایک دوپہر تھی، میں چھٹیاں گزارنے بستی آیا تھا اور یوں ہی گھومتا گھامتا اس چشمے پر چلا گیا تھا، جہاں سے گاؤں کی عورتیں پانی بھرا کرتی تھیں۔ وہ جب چشمے کی طرف آ رہی تھی تو اس کی پہلی ہی جھلک دیکھ کر، مجھے اپنے بدن میں ایک خاص طرح کی تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ پانی بھر کر گھڑا اپنے سر پر رکھتے ہوئے، اس کا آنچل، سینے سے سرکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر اس کے سینے کی طرف اٹھی تو میرے بدن میں لذت آمیز سرسراہٹ ہونے لگی تھی اور مجھے محسوس ہوا کہ میری رانوں کے بیچ ویسی ہی حرکت ہوئی، جو اس سے پہلے بھی درجنوں مرتبہ ہو چکی تھی لیکن میں اس کی توجیہہ کرنے سے ہمیشہ قاصر رہا تھا۔

اس دن سے بہت پہلے جب میں ابھی خاصا کم عمر تھا، کئی دفعہ سو کر اٹھتا تو میری نونوا اکڑی ہوئی ہوتی تھی اور جوں ہی میری ماؤں میں سے کسی کی نظر اس پر پڑتی وہ فوراً مجھے پیشاب کر کے آنے کا کہتیں۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جب یہ پیشاب سے بھر جاتی ہے تو اکڑ جاتی ہے، لیکن کئی دفعہ جب مجھے سخت پیشاب آیا ہوتا لیکن اس کے باوجود نہ اکڑتی تو مجھے حیرت ہوتی کہ ایسا کیوں ہے۔

ایک دن میں نے اپنی ماں سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے اس کا جواب، ایک چانٹے کی صورت میں دیا اور کہا کہ بچے گندی باتیں نہیں کرتے۔ کچھ دن بعد جب میں اسے کھجا رہا تھا اور میری ماں کی نظر اس پر پڑی تو انھوں نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر جھٹکتے ہوئے کہا کہ اس کو ہاتھ لگانے سے فرشتے بچوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ فرشتوں کے لعنت بھیجنے کی بات سن کر میں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس کے بعد میں

پیشاب کرتے ہوئے بھی اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا، جس کی وجہ سے کئی دفعہ میرے پائنچے تک گیلے ہو جاتے تھے اور اب مجھے شلوار گیلی ہونے کی وجہ سے مار پڑنے لگی تھی۔

انھی دنوں میں سے کسی دن، میں گھر کے پچھواڑے کھیل رہا تھا کہ میری نظر کھیت کے پچھلے کونے پر پڑی، جہاں بستی کا ایک شخص ناڑا کھول کر پیشاب کر رہا تھا، میں نے کبھی اس طرح بیٹھ کر پیشاب نہیں کیا تھا، یوں ہی کھڑے کھڑے، ناڑہ بندھی شلوار کو تھوڑا سا کھسکا کر، پیشاب کیا کرتا، اور پاخانے کے وقت پوری شلوار اتارا کر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے لیے ناڑا کھول کر اس طرح بیٹھنا نئی بات تھی، سو میں اس شخص کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب شُر شُر کی آواز ختم ہوئی اور اس کا پیشاب مٹی میں جذب ہو چکا تو میں نے دیکھا کہ اس نے وہیں کھیت سے ایک پتھر اٹھایا، اور آگے کی طرف لے گیا پھر اس نے وہ پتھر پھینکا اور دوسرا اٹھالیا، اس پر بھی وہی عمل دہرایا پھر تیسرا۔

جب وہ اٹھ کر واپس گھر کی طرف آنے لگا تو اس کے ایک ہاتھ میں ناڑا پکڑا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ شلوار کے اندر تھا۔ میں بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد اس کا اندر والا ہاتھ باہر آیا، جس میں اس نے پتھر پکڑا ہوا تھا، اس نے پتھر کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر اسے پھینک کر ناڑا باندھا اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے بھی پیشاب آیا تو میں نے بھی وہیں عمل دہرانا شروع کیا تو مجھے لطف سا آنے لگا۔ میں کافی دیر اسے پتھر سے سہلاتا رہا اور پھر گھر چلا آیا؛ کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ کہیں اس بات پر بھی ڈانٹ نہ پڑے۔

اب میں جب بھی گھر والوں سے چھپ کر پیشاب کرتا، یہی عمل دھراتا۔ ایک دن میں پیشاب کرنے کے بعد وہی عمل دہرا رہا تھا مجھے ایک اور طرح کا لطف آنے لگا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے جھاڑیوں میں کھسر پھسر محسوس ہوئی اور میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ پتھر شلوار سے نکال کے پھینکا تو جھاڑیوں سے تیتر پھُر کر کے اڑ گیا۔ میں نے مختلف تجربات سے سیکھ لیا تھا کہ کھردرے پتھر سے لطف نہیں آتا، جو پتھر ہموار اور چکنا ہو اسی سے، مجھے تحریک ملتی ہے، سو میں چکنے پتھر ایک جگہ جمع کر کے، رکھتا رہا اور پیشاب آنے کا انتظار کیا کرتا۔

❁

اس دن جب میری نظر حاجرہ کے سینے پر پڑی تو مجھے ویسی ہی لذت محسوس ہوئی ۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ بغیر اسے چھوئے اس میں ہلکی سی حرکت ہوئی تھی ۔ چوں کہ مجھے احساس تھا کہ ایسا ہونا ایک غلط کام ہے اس لیے میں نے فوراً وہیں چشمے کے کنارے بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سکیڑ لیں تا کہ اس کی نظر میری ٹانگوں کے بیچ ہونے والی حرکت پر نہ پڑے ۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جب ایک نظر میرے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہے ۔

کچھ دن بعد میں واپس مانگل چلا گیا۔ وہیں ایک دن وہ میرے خواب میں آئی اور مجھے بتایا کہ اس دن میں نے تمھاری چوری پکڑ لی تھی ۔ میں تھوڑا جھینپا تو اس نے کہا کہ اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے ۔

اس کے بعد میں جب بھی آتا بستی میں میری نظریں اسے تلاش کرتی رہتیں ؛ کبھی وہ سرسوں کا ساگ چن رہی ہوتی ؛ کبھی بکریاں چرا رہی ہوتی ؛ کبھی پانی بھر رہی ہوتی اور کبھی اپنے صحن میں جھاڑو دے رہی ہوتی ۔ میں نے کئی دفعہ اس سے علیک سلیک کی اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کیں لیکن اپنے دل کی بات اس سے نہ کہہ سکا ۔

آخری مرتبہ میں نے اسے بستی میں ہونے والی ایک شادی میں لبوں پر دنداسا لگائے اور بنے سنورے دیکھا تو مجھے اسے پہنچاننے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا، وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی اور اس کے سینے کے ابھار میرے اندر بے چینی سی بکھیرنے لگے تھے ۔ جب اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو ہم دونوں جھینپ سے گئے ۔ تاہم اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جس کے بارے میں سوچتے ہوئے، میرے بدن میں آج بھی ایک سنسنی سی دوڑ جاتی ہے ؛ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انتالیس سال پہلے جب اس نے بستی کی دوسری خواتین کے ساتھ اپنے سینے میں چھرا گھونپا ہو گا تو اس کی آنکھوں کی یہ چمک وحشت میں بدل گئی ہو گی ۔

اُنیس

گیارہ برس پہلے، جب میں نور پورشاہاں سے یہاں کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری باقی ماندہ زندگی یہاں گزرے گی۔ میرا خیال تھا کہ میں گھنٹا بھر اجڑ چکی بستی میں گھوموں پھروں گا، اگر وہاں نئے مکین بس چکے تو ان سے اپنا تعارف کرائے بغیر علیک سلیک کروں گا، اپنے آبائی قبرستان میں اپنے پیاروں کی قبریں تلاش کر کے ان پر فاتحہ پڑھوں گا اور اپنے بابا کے برباد شدہ ڈیرے پر کچھ دیر ٹھہر کر، اس کھنڈر حویلی کو دیکھنے جاؤں گا، جو بابا کو بہت عزیز تھی اور جہاں سے انھیں اپنے اجداد کی خوشبو آتی تھی۔ ایک دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد اس لواخ کو دیکھنے جاؤں گا، جسے میں نے ان کی ہدایت کے مطابق، انھی کے عطا کردہ نئے معانی کی روشنی میں روشن کرنا تھا لیکن ان کے جانے کے بعد اسے روشن کرنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

رات کنجور کے پتھروں سے بنے، اپنے دادا کے چھوٹے سے مقبرے میں گزاروں گا اور صبح سویرے یہاں سے رخصت ہو کر اگلی رات؛ ندی نیلاں میں بھوتو کے مقام پر موجود، اس چلہ گاہ میں گزاروں گا، جہاں آتے ہوئے، میں نے رات کو قیام کیا تھا؛ تا کہ صبح سویرے پہاڑ کی اوٹ سے ابھرتے سورج کی شفاف کرنوں میں، ان بڑی بڑی مچھلیوں کا نظارہ کر سکوں، جن کی جلد روشنی میں یوں دکھائی دیتی ہے، جیسے وہ سونے کی ہوں۔

ایسی مچھلیاں، میں نے اپنی زندگی میں اور کہیں نہیں دیکھیں؛ دریائے ہرو کے ان مقامات پر بھی نہیں، جہاں پانی اتنا گہرا ہے کہ اگر میرے ہم قد دو آدمی، ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہوں اور

او پر والا آدمی اپنی چھوی کو دستے کے بل، اپنے سر پر کھڑا کرے تو بھی اس کا تیز دھار پھل، ان تیز لہروں کو چھو نہ سکے جو اوپر سے گزر رہی ہوتی ہیں۔

میرا ارادہ تھا کہ اگلے دن، میں وہاں سے ندی نیلاں کے رستے واپسی کا سفر اختیار کروں گا اور سنگِ راہ کے مقام سے، جہاں کے ایک پہاڑی چشمے پر اس ندی کا اختتام ہوتا ہے، گزر کر، مارگلہ کے دامن میں واقع لوہے دندی کے قریب اسی جگہ کچھ دیر بیٹھوں گا، جہاں میں برسوں سے کبھی کبھی چکر لگاتا آیا ہوں، اس سکون کی تلاش میں، جو آج تک مجھے حاصل نہیں ہو سکا۔

ندی کنارے سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی، اگر کسی وجہ سے سفر کرنے کے قابل نہ رہے تو ہر تھوڑے فاصلے پر، اسے جندر کی صورت میں قیام کی سہولت مل جاتی ہے اور روکھا سوکھا ہی سہی کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ جندروئی بڑے مست الست لوگ ہوتے ہیں اور عموماً کھانے پینے کے پیسے نہیں مانگتے، لیکن اگر انھیں دے دیے جائیں تو لینے سے انکار بھی نہیں کرتے اور مجھ جیسے آدمی کی تو سادھو، سنت یا فقیر سمجھ کر، زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے عوض ہندو اور سکھ جندروئیوں کو سورگ اور مسلمانوں کو جنت جانے کی کنجی مل جاتی ہے؛ سو بستیوں میں مانگ کر کھانے اور مسجدوں میں مولویوں کے، جو بے چارے خود مانگ تانگ کر کھاتے ہیں، متھے لگنے سے بہتر ہوتا ہے کہ آدمی جندروئیوں کے ہاں ٹھہر جائے۔

ان کے پاس سنانے کے لیے بھی بہت کچھ ہوتا ہے، جس سے دل بہلا رہتا ہے؛ اگر کوئی جندروئی بہت کوڑھ مغز ہو، تو بھی اس کے پاس راجہ رسالو کی، راجہ سری کپ سے ہونے والی لڑائی اور دریائے دوڑ کے کنارے، رجوعیہ کے میدان میں سوئے ہوئے راجہ رسالو کو آ کر جگانے والے طوطے اور بعد از اں ایک دیو کو گندگر کے پہاڑی غار میں بند کرنے کی کہانی تو بہر حال ہوتی ہی ہے۔

یہ کہانی ہر جندروئی کے پاس کم و بیش ایک جیسی ہی ہوتی ہے صرف سنانے کا انداز مختلف ہوتا ہے؛ تاہم گھوڑی ڈیپنچ کی کہانی ہر جندروئی کے پاس اپنی ہوتی ہے اور بیشتر میں، مردِ جری وہی ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت گھوڑی ڈیپنچ کو دھوکا دینے میں کامیاب ضرور ہوا ہوتا ہے، ورنہ وہ یہاں بیٹھ کر مجھے اپنی

بہادری کی کہانی کیسے سنا رہا ہوتا۔گھوڑی ڈیپنچ کی کہانی سنانے والے جندروئی عموماً شوخ اور گپ باز ہوتے ہیں اور وہ اپنی بہادری کی داستان ایسے رجزیہ انداز میں سناتے ہیں، جیسے ان کے سامنے میں یا کوئی دوسرا انسان نہیں،ان کے روپ میں کوئی گھوڑی ڈیپنچ بیٹھا ہوا ہو۔

ایک جندروئی نے تو مجھے یہ کہانی بھی سنائی تھی کہ ایک دفعہ کسی مسافر کے روپ میں کوئی گھوڑی ڈیپنچ، جندر پر قیام کرنے آگیا تھا، جب میں اسے گھوڑی ڈیپنچ کی کہانی سنانے لگا تو مجھے شک ہوگیا کہ میں جسے کہانی سنا رہا ہوں وہ گھوڑی ڈیپنچ ہی ہے، میں نے فوراً ایک ہاتھ چولھے میں جلتی ہوئی لکڑی پر رکھا اور دوسرے سے اسے چھوا تو وہ غائب ہوگیا تھا؛ جب وہ یہ کہانی سنا رہا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ چولھے میں رکھے گلورنے پر تھا اور اس دوران اس نے مجھے تھاپڑا لگانے کے بہانے،کئی مرتبہ چھوا بھی تھا۔

❁

گیارہ سال پہلے مئی کی اُس گرم دوپہر جب میں یہاں پہنچا تو مجھے یہ علاقے چھوڑے اور نور پور شاہاں میں مقیم ہوئے اٹھائیس سال ہو چکے تھے۔

جب میں نے مغربی درے سے بستی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو مجھے خاصی دشواری ہوئی؛ وہ راستہ جو ہماری بستی کو مرکزی راستے سے ملاتا تھا مکمل طور پر اجڑ چکا تھا، اور اس کے ارد گرد، اگی جھاڑیوں اور اُن سے لپٹی، جھل کی خاردار بیلوں نے، پھیل کر، اسے بند کر دیا تھا۔ میں بجائے راستہ تلاش کرنے کے، یوں ہی اندازے کے مطابق چلتا، اور جھاڑیوں اور جھل کی بیلوں سے الجھتا، بستی میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ بستی بدستور اجڑی ہوئی ہے اور وہاں کسی انسان کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ کسی بھی مکان پر چھت نہیں تھی تاہم بعض مکانوں کی دیواریں اپنی استقامت کا پتہ دے رہی تھیں۔ چھتوں کے جلنے کے نشان دیواروں کے ان کونوں میں، جہاں بارش کا پانی کسی وجہ سے نہیں پہنچ پایا تھا، کالک کی صورت میں موجود تھے۔ ملبے کی کھدائی کے نشانات سے، جو اب خاصے مدھم ہو چکے تھے، اندازہ ہوتا تھا کہ چھت کی جو لکڑیاں جلنے سے بچ گئی تھیں انھیں یہاں کے، یا پھر کسی قریبی بستی کے باشندے، بعد

میں اکھاڑ کر لے گئے تھے۔

میں ندیوں اور نالوں کے کنارے بنے،جس رستے سے گزر کر یہاں پہنچا تھا وہ تقریباً سارے کا سارا ویران تھا کہ ہمارے ہاں اب بھی بستیاں زیادہ تر اونچی جگہوں پر بسائی جاتی ہیں۔لوگ ندیوں،نالوں اور کسیوں میں گھر بنانے سے کتراتے ہیں کہ ان کے نزدیک ایسی جگہیں بھاری ہوتی ہیں اور بھوت،چڑیلیں اور پچھل پیریاں انھیں اپنی آماج گاہ بنالیتی ہیں جب کہ دور دراز جانے والے بیشتر رستے جنگلوں میں گھری انھی ندیوں،نالوں،کٹھوں اور کسیوں سے گزرتے ہیں جہاں،پینے کو پانی اور کھانے کو جنگلی پھل خاص کر اخروٹ،انار دانے،جنگلی بیر،انجیر سیاہ،املوک وغیرہ بکثرت موجود ہوتے ہیں اور مسافر کو سوائے سردیوں کے چند مخصوص مہینوں کے کھانے پینے کی کوئی خاص فکر دامن گیر نہیں رہتی اوران دو مہینوں میں تو ٹھنڈ کی وجہ سے لوگ،سفر سے ویسے بھی گریزاں ہی رہتے ہیں۔

لیکن یہاں موجود ویرانی،اس ویرانی سے بالکل مختلف تھی؛اس میں ایک خاص طرح کی وحشت تھی،جو کاٹنے کو دوڑتی تھی۔اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ کھنڈر حویلی کی ویرانی عام ویرانیوں سے مختلف کیوں ہے؛شاید وہ جگہیں،جہاں انسان؛ہنستے کھیلتے،بھاگتے دوڑتے اور بولتے چالتے رہے ہوں،جب کسی وجہ سے ویران ہو جاتی ہیں تو اس میں دہشت کے درجے کو پہنچی ہوئی،وحشت شامل ہو جاتی ہے۔

بستی کے باہر مشرقی سمت موجود،ہمارا آبائی قبرستان،مجھے پہلے سے کہیں زیادہ آباد نظر آیا۔ میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔میں قبرستان میں داخل ہو کر اس کونے کی طرف گیا،جہاں میرے اندازے کے مطابق،میری دونوں ماؤں،دادی،چچا اور چچی کی قبریں موجود ہو سکتی تھیں۔بیشتر قبریں ہموار ہو چکی تھیں؛بس ان کے سرہانے لگا بے نام پتھر ان کے قبر ہونے کا گواہ تھا،البتہ کچھ قبریں ایسی بھی تھیں،جو بہتر حالت میں تھیں شاید ان کے ورثا،اب جہاں کہیں بھی تھے،کبھی کبھار یہاں فاتحہ کرنے آتے تھے اور ان کے اوپر مزید مٹی ڈال جاتے تھے۔

میں نے اپنے خاندان کی قبروں والے کونے میں کھڑے ہو کر باری باری سب کو یاد کیا،ان کے لیے فاتحہ کی اور آنسو بہائے۔اچانک میری نم آلود آنکھوں کے سامنے حاجرہ بی بی کا ہنستا مسکراتا چہرہ

ابھرا۔اس کی آخری آرام گاہ کی تلاش میں، میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی؛ ایک قبر کو، اس کی قبر فرض کر کے، اس کے لیے بھی فاتحہ کی اور واپس ڈھیر ہو چکی، بستی کے اس حصے میں گیا، جہاں، اس دور میں اس بستی کا سب سے شاندار مکان ہوا کرتا تھا اور اب اس کا اتنا ہی عظیم کھنڈر، میری وحشت میں اضافہ کر رہا تھا۔

میں اپنے اجڑے صحن میں داخل ہوا اور اس تھلی کے نشانوں کے پاس کھڑا ہو کر، جہاں سے اتر کر ہم جانوروں کے باڑے میں داخل ہوتے تھے، اُس رستے کی طرف دیکھنے لگا، جو مشرقی سمت سے بستی میں داخل ہوتا تھا۔

اچانک میری آنسو بھری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا، جب میں مانگل سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس لوٹا تھا۔

❁

برسوں پہلے؛ اس روز جب میں چچا کے ساتھ، جو علی الصبح ایک خالی گھوڑے کے ہمراہ، مجھے لینے مانگل پہنچے تھے؛ بستی میں داخل ہوا اور میری نظر رستے کی سیدھ میں موجود اپنے گھر پر پڑی تو میں نے چھوٹی ماں کو صحن کے داخلی دروازے کے پاس، رستے پر نظر جمائے، کھڑے دیکھا تھا؛ شاید اسے اندازہ تھا کہ میں پہنچنے والا ہوں۔

کچھ لمحوں بعد، جب میں نے دوبارہ دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھیں، مجھے شک سا گزرا کہ شاید ان کا وہاں نظر آنا، میرا واہمہ تھا، لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنی دونوں مائیں وہاں کھڑی نظر آئیں جب کہ میرے چچا زاد گھر کے دروازے سے باہر نکل کر نیچے باڑے کی طرف آرہے تھے؛ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے دیکھ کر بڑی ماں اور چچا زاد بھائیوں کو بلانے گئی تھیں تا کہ وہ میرا استقبال کر سکیں۔

جوں ہی ہم باڑے میں داخل ہوئے ایک بھائی نے بھاگ کر چچا کے گھوڑے کی اور دوسرے نے میرے گھوڑے کی باگ تھام لی تا کہ ہمیں اترنے میں مدد دے سکیں۔ بڑے چچا زاد کو گلے لگاتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ گذشتہ چھ ماہ میں اس نے خاصا قد بت نکال لیا ہے اور اس کے چہرے پر مسیں بھیگنا شروع ہو گئی ہیں۔ میری دونوں مائیں بھاگتی ہوئی دروازے پر آئیں اور باری باری مجھے

سینے سے لگایا پھر میرے گال اور ماتھے پر بوسے دینے لگیں۔صحن میں داخل ہوا تو میرے دوسرے عزیز و اقارب چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، مردوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور عورتوں نے میرے ہاتھوں پر روایتی بوسے دے کر شفقت کا اظہار کیا۔

صحن میں داخل ہوتے ہی مجھے مکھن، ساگ، لسی اور مکئی کی روٹی کی خوشبو نے گھیر لیا تھا، جو مکتب میں بھی کبھی کبھار دستیاب ہو جاتی تھی لیکن اس میں ماں کے ہاتھ والا ذائقہ مجھے کبھی نہیں محسوس ہوا۔میں دسترخوان پر بیٹھا تو چھوٹی ماں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے مکھن میں بھیگی ہوئی روٹی کا نوالہ توڑ کر دیا۔

میں جوان ہو چکا تھا لیکن ماں ہمیشہ مجھے بچوں کی طرح خود روٹی توڑ کر دیتی تھی اور لسی کٹورے میں خود ڈالتی تھی، میں اسے منع بھی کرتا تھا لیکن وہ اس وقت تک میرے پاس بیٹھی رہتی تھی، جب تک میں کھانا ختم نہیں کر لیتا۔وہ مجھے کھاتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔میں جب بھی بستی آتا، پہلے سے زیادہ قد بت نکال کر آتا لیکن اسے میں ہمیشہ کمزور ہی دکھتا۔میں جوں ہی سیر ہوتا اور کھانے سے ہاتھ کھینچتا وہ کہتی ۔ ''اور کھا۔دیکھ تو کتنا کمزور ہو گیا ہے، وہاں کا کھانا تجھے راس نہیں آیا۔''

اس دن بھی اس نے اپنا وہی روایتی جملہ دہرایا تھا، جو سیکڑوں بار پہلے بھی میں سن چکا تھا، حالاں کہ جب میں صحن میں داخل ہوا تھا تو کئی خواتین نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا ''ماشاء اللہ۔کیسا گبھرو جوان ہے، بالکل اپنے باپ پر گیا۔''

ماں برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف جانے لگی تو اچانک میرا دھیان بابا کی طرف گیا، وہ ابھی تک نظر نہیں آئے تھے۔''شاید مردانے میں ہوں۔'' میں نے سوچا اور مجھے شرمندگی سی ہونے لگی کہ مجھے کھانا کھانے سے پہلے انھیں سلام کرنے جانا چاہیے تھا۔میں نے جلدی سے جوتے پہنے اور مردانے کی طرف جانے لگا تو ماں برتن رکھ کر پلٹ رہی تھی۔

''تمھارے بابا ڈیرے پر ہیں، حسن علی خان آئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ غلام خان ترین بھی ہیں۔'' میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھیں۔''تم تھکے ہوئے ہو۔کمرے میں جا کر آرام کرو۔جب آئیں

گے تو میں جگا دوں گی۔'' لیکن میں بجائے آرام کرنے کے، ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ ماں مجھے پکارتی ہی رہ گئی تھی۔

❁

اس منظر کو یاد کرتے ہوئے میں یک دم چونک اٹھا، مجھے لگا جیسے میری ماں نے مجھے ابھی ابھی آواز دی ہے۔ میں نے قبرستان کی سمت دیکھا، جہاں معدوم ہوتی قبروں کے نشانوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے بستی کے کھنڈرات سے وحشت سی ہونے لگی تھی سو میں نے وہ بے ڈھنگا سا تھیلا، جو سفر و حضر میں ہمیشہ میرا ساتھی رہا تھا اور جسے میں نے کچھ دیر پہلے، اُس کمرے کے کھنڈر کی دیوار پر رکھا تھا، جس میں بستی میں قیام والی رات بابا سویا کرتے تھے، اٹھایا اور جھاڑیوں سے اٹے رستے پر قدم دھرتا ہوا، واپس مڑا اور ڈیرے کی طرف جانے والا، وہ رستہ تلاش کرنے لگا، جس پر میں اس دن چل کر بابا؛ حسن علی خان اور غلام خان ترین سے ملنے گیا تھا۔ سو ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی کہ بستی کے باہر کی طرف سے ڈیرے کی طرف جانے والا، رستہ اب بھی بدستور آباد ہے؛ اس حیرانی نے میرے قدموں کی رفتار اور بھی بڑھا دی۔

میرے اندر خوشی کی ایک لہر سی اٹھی کہ ہمارا ڈیرا آباد ہے۔

یہ ڈیرا کس نے آباد کیا؟ یہ دیکھنے کا تجسس مجھے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا تھا۔ میں نے میل بھر کا یہ عمودی سفر ڈھلتی عمر کے باوجود آدھے گھنٹے سے کم وقت میں طے کر لیا تھا۔ جوں ہی میں ڈیرے سے پچاس گز دور، اس جگہ پہنچا، جہاں سے زمین دوز ڈیرے پر بنی ممٹی نظر آتی تھی، یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ڈیرا نہ صرف سلامت تھا بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ آباد دکھائی دے رہا تھا۔ جب میں ڈیرے کی حدود میں داخل ہوا تو وہاں پولیس کے ایک دو سپاہیوں کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید وہ یہاں کسی کو گرفتار کرنے آئے ہیں لیکن جب سامنے لگی ایک تختی پر نظر پڑی تو عقدہ کھلا کہ انگریز سرکار نے اس پر قبضہ کر کے اس میں اپنا تھانہ قائم کر لیا ہے۔

میں وہاں سے پلٹنے لگا تھا لیکن یک دم ٹھٹھکا اور بجائے واپس پلٹنے کے تھانے کے دائیں

طرف سے گزرتے، اس راستے پر ہولیا، جو آگے جا کر اسی راستے سے مل گیا تھا، جو کھنڈر حویلی کے پاس سے گزرتا ہوا داد کے مقبرے کی طرف جاتا تھا۔ بے شک دادا کے مقبرے یا کھنڈر حویلی کی طرف میرا شروع ہی سے جانے کا ارادہ تھا لیکن اس وقت میں سامنے کا منظر دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ واپس پلٹنے کی صورت میں پولیس مجھے مشکوک سمجھ کر گرفتار کر سکتی ہے اور بابا کا وہ نوشتہ ان کے ہاتھ آ سکتا ہے، جو اس وقت بھی میرے کاندھے سے لٹکے ہوئے اُس بے ڈھنگے اور بوسیدہ تھیلے میں ان کی پگڑی اور تلوار کے ساتھ موجود تھا، جسے اٹھائیس سال قبل، عبدل چچا نے، غلام خان ترین کی حویلی میں مجھے تھمایا تھا۔

بیس

کوہِ ناڑہ کی چوٹی پر موجود اپنے دادا کے مقبرے اور بابا کے ڈیرے کا خیال، جواب تھانہ بن چکا ہے، مجھے اس وقت آیا تھا جب میں مارگلہ کی پہاڑی عبور کر چکا تھا۔ اس سے پہلے میرے دھیان میں صرف بستی کا ناک نقشہ اور وہ کھنڈر حویلی تھی، جس سے بابا کو ایک خاص طرح کی خوشبو آتی تھی؛ اسی خوشبو کے باعث انھوں نے لوگوں کی مخالفت کے باوجود، دادا کی لاش کو دریائے نین سکھ کے کنارے واقع کسی قبرستان سے نکال کر یہاں دفن کیا تھا اور کنجور کے انھی پتھروں سے ان کی قبر پر ایک مقبرہ سا بنا دیا تھا تاکہ وہ خوشبو جو وہ ساری زندگی محسوس نہیں کر سکے مرنے کے بعد محسوس کر سکیں۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو کنجور کا مقبرہ تعمیر کیا جا چکا تھا لیکن اس وقت تک ان کی تمام کرامتیں ہمارے خاندان سمیت کسی پر ظاہر نہیں ہوئی تھیں، جواب زبان زدِ خاص و عام ہیں؛ خاص کر یہ کہ جب ان کی میت کو کئی دنوں کے بعد دریائے نین سکھ کے کنارے پر موجود قبر سے نکال کر یہاں لا کر دفن کیا گیا تھا تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور جس راستے سے یہ میت لائی گئی تھی، کئی سال تک وہاں سے خوشبو آتی رہی تھی۔

اگر ایسی بات ہوتی تو بابا اُس نوشتے میں، اس اہم واقعے کا ذکر ضرور کرتے، جسے میں پچھلے سال پہلے تک سینے سے لگائے پھرتا تھا اور جسے میں نے بلا مبالغہ سیکڑوں بار پڑھا ہے۔ اب یہاں آ کر مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہ بہت بڑے لکھے اور عالم و فاضل شخص تھے اور انھوں نے یہ تمام علوم خواجہ خضر سے سیکھے تھے، جن سے ان کی ملاقات سمندر کھٹہ کے ایک جندر پر ہوئی تھی۔ اس کا کوئی ذکر نہ تو نوشتے

میں تھا اور نہ ہی ان دنوں اس بارے میں کوئی روایت مشہور تھی۔ بابا کے نوشتے کے مطابق؛ دادا صرف عربی پڑھ سکتے تھے اور وہ بھی صرف وہ کتابیں جن پر پورے اعراب لگے ہوئے ہوں۔ اعراب کے بغیر وہ ایک لفظ نہیں پڑھ سکتے تھے، چاہے وہ لفظ عربی ہی کا کیوں نہ ہو۔ بستی کے جن لوگوں نے ان سے قرآن پڑھا تھا وہ تو قرآنی لفظوں کے جوڑ بھی عجیب طریقے سے کرتے تھے۔ جیسے:

اب تے لام کل، الف توں ال، اب تے میم کم، ح توں حم، او بو دال کُو دو؛ الحمد۔

جب کہ ہمیں مدرسے میں اس کا جوڑ یوں کرایا جاتا تھا؛

الف زبر لام ال، ح زبر میم حم، دال پیش دو؛ الحمد

یہ کرامتیں ان سے کیسے منسوب ہوئی، میرے لیے آج بھی یہ بات معمہ ہے؛ لیکن یہ بات طے ہے کہ یہی وہ کرامتیں ہیں، جن کی وجہ سے اب ان کا مزار مرجع خلائق ہے، یہاں آئے روز دور دور سے زائر حاضری دینے آتے ہیں،؛ خاص کر جمعرات اور جمعے کو۔

گیارہ سال قبل اس روز جب میں تیز تیز قدم اٹھاتا چڑھائی چڑھ رہا تھا، اس خوف سے کہ مبادا پیچھے سے کوئی سپاہی مجھے دیکھ لے اور واپس بلا کر تفتیش شروع کر دے، وقتی طور پر میرے ذہن سے کھنڈر حویلی اور مقبرہ دونوں غائب ہو گئے تھے اور میرے ذہن میں ناظم خان کی آنکھوں میں منجمد موت کے سائے، اتنی شدت سے دوبارہ عود کر آئے تھے، جیسے میں نے ابھی ابھی اس کے سینے میں تلوار گھونپی ہو۔ سو میں اس کی موت کا منظر ذہن سے بار بار جھٹکتے ہوئے جلدی جلدی راستہ پاٹتا رہا تھا، یہاں تک کہ میدان کے سرے سے گردن نکالتے ہی، میری نظر اگربتیوں کی خوشبو میں نہائے، ایک مزار کے شاندار گنبد پر پڑی؛ یہ تھا تو اسی جگہ، جہاں بابا نے دادا کی قبر پر ایک چھوٹا سا مقبرہ بنایا تھا لیکن، یہ اس سے کہیں بڑا اور عالی شان تھا۔ مزار کے ارد گرد ایک وسیع احاطہ تھا، جس میں کئی ملنگ لیٹے ہوئے تھے اور کچھ لوگ جو، ارد گرد سے آئے ہوئے زائر لگتے تھے، عقیدت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے ہلتے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ فاتحہ پڑھ کر دعائیں مانگ رہے ہیں کہ ان کی دلی مرادیں پوری ہوں۔

میں کافی دیر تک ادھر اُدھر حیرانی سے دیکھتا رہا۔ زائرین نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن

وہاں لیٹے ہوئے ایک دو ملنگ مجھے دیکھ کر چونکے۔ یقیناً انھوں نے میرا حلیہ دیکھ کر سوچا ہوگا کہ کوئی ہمارے رزق پر ڈاکا ڈالنے آ گیا ہے۔ مجھے ان کے بارے میں یہ گمان اس لیے بھی گزرا تھا کہ برسوں پہلے، جب میں بری امام کے مزار کے احاطے میں، پہلے پہل داخل ہوا تھا اور ایک کونے میں بیٹھنے کے لیے فرش صاف کر رہا تھا تو وہاں کے ملنگوں نے بھی مجھے اسی نظر سے دیکھا تھا حالاں کہ وہاں لنگر اتنا وافر ملتا تھا کہ ملنگوں کے علاوہ، ارد گرد کے علاقوں میں محنت مزدوری کرنے والے بھی لنگر کے وقت برتن اٹھائے وہاں قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جن کے پاس برتن نہیں ہوتے تھے، وہ چاولوں کے لیے جھولی آگے کر دیتے تھے، یہ سوچے بغیر کہ اس سے کپڑے خراب ہو جائیں گے؛ جنھیں وہ بعد میں وہیں سے گزرتی ندی پر ریت مل مل کر دھوتے تھے، وہ صاف تو ہو جاتے تھے لیکن ان پر لگے گھی کے چکنے نشان ہمیشہ کے لیے قمیص پر ثبت ہو جاتے تھے اور میں بازار میں پھرتے ایسے لوگوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کرتا تھا کہ یہ لنگر خور ہیں۔

میں کافی دیر مزار کے احاطے میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا، اور جب مزار کے اندر داخل ہوا تو چاروں کونوں میں اگربتیاں چل رہی تھیں، مزار پر سبز رنگ کی چادر پڑی ہوئی تھی اور لوحِ مزار پر جلی حروف میں یہ عبارت درج تھی۔

"مرکز تجلیات

مرد مجاہد، شہید بالاکوٹ حضرت سید محمد خان قادری رحمتہ اللہ علیہ

المعروف

جنگاں والی سرکار"

اور نیچے یہ شعر درج تھا:

"کشتگانِ خنجرِ تسلیم را

ہر زماں از غیب جانِ دیگر است"

دادا کے نام کے پہلے حصے سید (برون قید) پر شد ڈال کر سید کر دیا گیا تھا حالاں کہ ان کا نام

سید بغیر تشدید کے تھا اور یہ نام ہمارے ہاں بے شمار لوگوں کے ناموں کا حصہ ہے جو سادات میں سے نہیں تھے۔ میں حیرانی سے قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ رہا تھا؛ حیرانی کا غلبہ اس قدر تھا کہ مجھے فاتحہ پڑھنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ جب میں نے ایک نئے زائر کو اپنے دائیں جانب کھڑے فاتحہ پڑھتے دیکھا تو مجھے خیال آیا اور میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

میں پلٹ رہا تھا کہ ایک شخص نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، اس خیال سے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے، میں نے نظریں چرا لیں اور اس کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ جمعرات کا لنگر تیار ہو رہا ہے کھا کر جائیے گا۔ میں نے "اچھا" کہہ کر دل ہی دل میں شکر بھی ادا کیا کہ وہ کسی اور مقصد سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں مزار کے احاطے کی مغربی سمت والی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کھنڈر حویلی کے درخت کٹ چکے ہیں اور اس کے تمام کمروں پر چھت ڈھل چکی ہے۔ صحن میں جو ایک دو درخت موجود تھے ان کی چوٹیوں پر سبز جھنڈے لہرا رہے تھے۔ درختوں کی ان شاخوں سے، جو حویلی کی چھت کے اوپر سے مزار کے احاطے کی طرف جھکی ہوئی تھیں، تعویذ گنڈے لٹک رہے تھے۔

میں نے تھوڑا آگے جا کر دیکھا تو مجھے وہی پتھریلا زینہ نظر آیا، جس پر پاؤں رکھ کر میں برسوں پہلے کے اُس دن، جب میں نے زندگی میں پہلی بار یہ کھنڈر حویلی دیکھی تھی، بابا کے ساتھ اس میدان میں داخل ہوا تھا جہاں کنجور کے پتھروں سے بنا ان کا مقبرہ، اب ایک عالی شان مزار میں بدل چکا ہے۔

برسوں پہلے کے اُس دن تو جھاڑیوں کو ہٹا کر، ہم نے بہت مشکل سے یہ زینہ تلاش کیا تھا لیکن اب کی بار مجھے اس کے لیے کوئی تردد نہیں کرنا پڑا تھا کہ اس کے ارد گرد کی جھاڑیاں، کاہو کے اس ٹیڑھے میڑھے تنے سمیت غائب تھیں، جسے ہم نے مشکل سے پھلانگا تھا۔ میں سیڑھیاں عبور کر کے نیچے اترا اور کھنڈر حویلی میں داخل ہوا تو مجھے ویسی ہی حیرانی کا سامنا کرنا پڑا، جیسا برسوں پہلے بابا کے ساتھ، یہاں پہلی بار آتے ہوئے کیا تھا۔

تمام دیواروں پر سے سبز بیل غائب تھی اور اندر گرے ہوئے پتھروں کو سلیقے سے دیواروں

میں چن کر، یہیں سے کاٹے ہوئے، کاہو کے درختوں کی کڑیاں اور بالے بنا کر تمام کمروں پر چھت ڈالی گئی تھی۔فرش بالکل ہموار تھا۔کمروں سے صدیوں پرانے بت غائب تھے،تاہم دیواروں کی بنیادوں میں نصب بڑے پتھروں پر ان کے باریک نقش موجود تھے۔وہاں ایک تختی آویزاں تھی،جس پر یہ عبارت درج تھی۔

''یہاں حضرت سید محمد خان رحمتہ اللہ علیہ نے جنگ بالاکوٹ میں حصہ لینے سے پہلے برسوں چلہ کشی کی اور دیواروں پر بنے یہ مقدس نقش انھوں نے اسی تلوار سے بنائے تھے،جس سے بعدازاں انھوں نے درجنوں سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔''

دیواروں میں بنے طاقوں میں سے بیشتر میں چراغ موجود تھے اوران میں سے ایک دو میں، جو چراغوں سے تہی تھے،قرآن رکھے ہوئے تھے،جو شاید ان لوگوں کے لیے تھے جو یہ سوچ کر یہاں قرآن کی تلاوت کرتے تھے کہ ان کے مرشد نے یہاں بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کی تھی۔ایک کمرے میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا،جس میں زیادہ تر تفاسیر، احادیث اور فقہ کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔بیشتر کتابیں خاصی قدیم معلوم ہوتی تھیں۔دروازے پر ایک تختی آویزاں تھی،جس پر یہ عبارت درج تھی۔

''اس کتب خانے کی بیشتر کتابیں،حضرت شاہ ولی اللہ کے ذاتی کتب خانے کی ہیں؛جنھیں حضرت شاہ اسماعیل دہلوی اپنے ساتھ لائے تھے۔جنگ بالاکوٹ میں ان کی شہادت کے بعد،ان کے میر منشی نے یہ کتابیں کھیتوں میں چھپادی تھیں تاکہ سکھ انھیں جلا نہ سکیں۔بہت سی کتب کئی مہینے وہاں پڑی رہنے کی وجہ سے خراب ہوگئی تھیں،اور کچھ کو لوگ اٹھا کر لے گئے،جو کتابیں بچ گئیں انھیں یہاں منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ ان سے استفادہ کرسکیں۔''

ایک چھوٹے سے خانے میں نئی کتب علاحدہ سے سجا کر رکھی گئی تھیں،جس میں مہتاب سنگھ کی کتاب بھی موجود تھی۔میں کافی دیر تک اس تبدیلی کو غور سے دیکھتا رہا۔

میں نے ان کتابوں سے نظر ہٹا کر مغرب کی طرف دیکھا تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور اس کی آخری کرنیں کاہو کی جھکی ہوئی شاخوں کے درمیان سے چھن چھن کر اندر کی طرف آرہی تھی۔

اتنے میں وہی شخص، جس نے مجھے مزار پر غور سے دیکھا تھا، ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل نما دلھی اٹھائے، کھنڈر حویلی میں داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا، تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے یوں لگا، جیسے اسے میری یہاں موجودگی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ مشعل نما دلھی اٹھائے، میرے پاس سے گزر کر طاق میں رکھے چراغ کے پاس گیا، جوں ہی دلھی کے شعلے نے چراغ کے فتیلے کو چھوا، وہ جل اٹھا۔ پھر وہ دلھی لیے دوسرے کمرے کی طرف گیا۔ اس نے باری باری تمام چراغ روشن کیے اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں تمام کھنڈر حویلی بقعہ نور بن گئی۔ وہی کھنڈر حویلی، جس سے میرے بابا کو اپنے اجداد کی خوشبو آتی تھی، آج ان کے ایک جد کی چلہ گاہ سے منسوب ہو چکی تھی؛ وہی جد جس نے انھیں یہ کہہ کر جھٹک دیا تھا کہ:

''اچھا تو وہاں جو بت رکھے ہوئے ہیں وہ تمھارے اجداد نے تراشے تھے۔''

مجھے یہ سب جان کر بہت خوشی ہوئی؛ اتنی خوشی کہ میرے سامنے کھڑے اس اجنبی شخص نے بھی اسے محسوس کیا، جس نے بعد میں اپنا نام عبدل بتایا تھا اور جس کے اصرار پر میں یہاں ٹھہر گیا تھا اور آج تک یہیں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ اب میری باقی ماندہ زندگی یہیں ایک ملنگ کے طور پر گزرنی ہے؛ اپنے ہی دادا کے ملنگ کے طور پر۔

اکیس

''میں نے آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔'' عبدل نے، جو تقریباً مجھ سے عمر میں دس بارہ سال بڑا ہے، اور اُس عبدل چچا سے مختلف شخصیت کا حامل ہے، جو بابا کا چچازاد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا ہم عمر اور ہم راز بھی تھا، مجھے کئی دن بعد، جب ہم ایک دوسرے سے اچھے خاصے مانوس ہو چکے تھے، اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا تھا۔ اس سمے اس کی آنکھیں چرس پی پی کر سرخ انگارہ ہو چکی تھیں اور وہ اپنی موج میں اس بات سے بے پروا تھا کہ سامع کو اس میں کوئی دلچسپی بھی ہے یا نہیں۔

''باواجی، مجھے لڑکپن میں اصیل مرغ لڑانے کا بہت شوق تھا؛ اور یہ شوق میرے اندر میری ماں کے دودھ سے منتقل ہوا تھا کہ میرے نانا بہت بڑے ککڑ باز تھے اور ایک ککڑ باز کے طور پر ان کی شہرت پورے علاقے میں تھی حالاں کہ ان کے خاندان میں اس پیشے کو رذیل سمجھا جاتا تھا۔

چوں کہ وہ ایک بڑے خاندان کے فرد تھے سو ان کے ہاں گھوڑے پالنے کا شوق تھا، ان کے اصطبل میں ہر نسل کا گھوڑا موجود تھا، پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے، اس علاقے میں گھڑدوڑ وغیرہ کا رواج نہیں تھا لیکن ان کا خاندان اس شوق کو پورا کرنے کے لیے دور دراز کے سفر طے کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ پنجاب کے میدانی علاقوں تک کا سفر جو کئی کئی دن پر محیط ہوتا تھا، ان کے لیے معمولی بات ہوا کرتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ نانا کو ککڑ بازی کا یہ شوق نواح منکیرہ کے ایک علاقے میانوالی سے چرایا تھا، جہاں ان کے والد اور بڑے بھائی گھڑدوڑ کے ایک مقابلے کے لیے اپنا گھوڑا، جس کا نام انھوں نے ہمارے علاقے کے ایک جری فرد، نور خان کے نام پر، نورا رکھا ہوا تھا، خصوصی طور پر لے کر گئے تھے۔

میرے نانااس وقت لڑکپنے میں تھے، وہاں قیام کے دوران میں، ان کاایک ہم عمر، ان کا ہم جولی بن گیا تھا۔ایک دن وہ انھیں اپنے گھر لے گیا، جہاں انھوں نے کئی رنگ ونسل کے مرغے دیکھے اوراس کے باپ نے انھیں دو چوزے تحفے کے طور پر دیے۔ نانا کے بڑے بھائی نے انھیں منع کیا لیکن ان کے ہم جولی کے باپ نے، جو اپنے علاقے کا سردار تھا، جب اصرار کیا تو وہ راضی ہو گئے۔

میرے نانا وہ چوزے ساتھ لے آئے، جنھیں پال پوس کر انھوں نے لڑانا شروع کر دیا۔ایک دن ،ان کے والد کو کہیں دور دراز کے سفر سے واپسی پر، پتہ چلا کہ ان کا بیٹا باقاعدہ ککڑ باز بن گیا ہے تو انھوں نے ان مرغوں کو ذبح کرنے کا حکم دے دیا، جس پر سیخ پا ہو کر میرے نانا نے ذبح کرنے والے شخص کی، جو ان کا گھریلو ملازم تھا، جان لے لی۔ پڑ نانا نے نانا کو سزا کے طور پر، اپنے گھر سے بے دخل کر دیا اور انھوں نے قریہ قریہ گھوم کر مرغ لڑانے کا پیشہ اختیار کر لیا۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مرغوں کی لڑائی کے لیے دہلی تک کا سفر کیا تھا اور وہاں کے مغل شہزادوں میں سے ایک کے مرغے سے، جسے ککڑبازی کا شوق تھا، اپنا مرغا لڑایا تھا۔اس لڑائی میں ان کا مرغا جیت گیا تھا اور مغل شہزادے نے انھیں، برسرِجلسہ منہ مانگی قیمت دینے کا اعلان کیا اور جب میرے نانا نے انکار کر دیا تو شہزادہ خود تو خاموش رہا لیکن اس کے محافظ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور انھوں نے شہزادے کے ساتھ اس ہتک آمیز رویے پر، طیش میں آ کر، نانا سے مرغا چھین لیا لیکن شہزادے نے، ان سے مرغا لے کر، انھیں واپس کر دیا اور واپس قلعہ معلیٰ میں چلا گیا۔

میرے نانا، جو اس ملک میں پردیسی تھے، رات بھر، دن کو ہونے والے اس واقعے کے بارے میں سوچتے رہے اور صبح دم، انھوں نے قلعے کے محافظوں سے کہا کہ وہ یہ مرغ مغل شہزادے کو مفت دینا چاہتے ہیں۔شہزادہ باہر آیا اور انھیں اپنے ساتھ اندر لے گیا اور انھیں وہاں کئی دن تک مہمان کے طور پر رکھا۔کئی دن کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگے تو انھیں بہت سے قیمتی جواہرات بطور تحفہ پیش کیے۔میرے نانا نے انکار کیا تو وہ اندر سے مرغ واپس لے آیا اور کہا کہ اگر تم ہمارے تحائف نہیں رکھو گے تو اپنا تحفہ واپس لے لو؛ بادل نخواستہ نانا کو وہ تحائف قبول کرنا پڑے۔

وہیں ان کی ملاقات ہمارے خطے کی ایک شہزادی سے بھی ہوئی تھی، جو یہاں کی ایک ریاست کے والی کی بیٹی تھی اور وہاں بیاہی گئی تھی۔ اس نے جب سنا کہ اس کے خطے سے کوئی شخص یہاں آیا ہے تو وہ اس سے ملنے خصوصی طور پر آئی تھی۔

میری نانی کو نانا نے بتایا تھا کہ انھیں زنانے میں اس عورت سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی بلکہ شہزادی باپردہ ہو کر ایک علاحدہ کمرے میں آئی تھی اور پردے کے پیچھے سے، اس نے سرگوشی میں باتیں کی تھیں اور کہا تھا کہ میرے ماں باپ نے زمین کی خاطر مجھے یہاں بیاہ دیا ہے۔ میرے میاں کی چار بیویاں اور چالیس سے زائد کنیزیں ہیں اور وہ زیادہ تر کنیزوں ہی میں گھرا رہتا ہے۔ ساری کی ساری بیویاں ہندوستان کے بڑے خاندانوں کی ہیں، جن میں سے دو کے خاندان اب بھی ہندو ہیں اور انھیں محض کلمہ پڑھا کر، ان کا نکاح میرے شوہر سے کر دیا گیا ہے۔ وہ ابھی تک کسی قسم کے گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتیں یہاں تک کہ بکرے کے گوشت کو بھی، جس کی بو سونگھتے ہی ہمارے پیٹ میں مچھلیاں دوڑنے لگتی ہیں۔ ہاں جب کبھی ہمارا شوہر گھر آتا ہے تو وہ انھیں اسلامی طریقے سے سلام ضرور کرتی ہیں۔ لیکن جب چلا جاتا ہے تو وہ اپنے بتوں کو اسی طرح پوجنے لگتی ہیں، جس طرح وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں پوجتی تھیں۔

میرے لیے یہ کہانی عجیب تھی؛ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی سکھ یا ہندو عورت کا نکاح کسی مسلمان سے ہو سکتا ہے۔ مسجد میں ہمیں سکھایا گیا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا جائز نہیں خاص کر ماس کھانا تو بالکل بھی روا نہیں اگرچہ ان کے ہاں ماس کھانے کا رواج بہت کم تھا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا، رکا، چرس بھرے حقے کو تازہ کیا اور گویا ہوا۔

"پھر مجھے ایک سکھنی سے محبت ہو گئی۔ مہتاب کور نام تھا اس کا۔

میرا خیال تھا کہ میں اسے کلمہ پڑھا کر دلی کے شہزادے کی طرح، اپنے عقد میں لے آؤں گا لیکن جب میں نے اس کا اظہار اپنی ماں سے کیا تو اس نے چٹنی کوٹنے والا دستہ اٹھایا اور میں، جو اس کے غیر متوقع ردعمل سے پریشان ہو کر، بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے، اسے زور سے میری پیٹھ میں دے

مارا لیکن میں مار کھا کر بھی مایوس نہیں ہوا؛ میرا خیال تھا کہ میں ماں کو کسی اچھے وقت منالوں گا۔

ایک دن جب وہ پانی بھرنے گئی اور میں نے اس سے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو میں اس سے شادی کرلوں گا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ اگر تو سکھ بھی ہو جائے تو بھی میں تجھ سے شادی نہیں کروں گی۔ میں ایک عرصے تک اس کی بات کو مذاق سمجھتا رہا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن مسلمان ہو کر مجھ سے شادی کرلے گی۔

دو سال بعد، جب اس کی شادی، ایک سکھڑے کے ساتھ ہوگئی تو میں مکمل طور پر مایوس ہوگیا۔ اتفاق سے انھی دنوں ہمیں اطلاع ملی کہ سکھ ہماری ریاست پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور میری ماں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے، اس جنگ میں سکھوں کو قتل نہ کیا تو میں تمھیں اپنی بتیس دھاریں نہیں بخشوں گی۔ یہ وہی جنگ تھی، جسے بعد میں جنگِ ناڑہ کا نام دیا گیا تھا، اور اس میں تمھارے بابا نے ادھیڑ عمری کے باوجود، وہ دادِ شجاعت دی تھی کہ جنگِ سمندر کٹھہ کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ میں اس جنگ میں تمھارے بابا کے ساتھ لڑا تھا۔ جب بھی کوئی سکھ میرے سامنے آتا، مجھے مہتاب کور کی بے وفائی یاد آجاتی اور میرے جنون میں اضافہ ہو جاتا اور میں سب سے آگے بڑھ کر حملہ کرتا۔ ایسے ہی کسی لمحے تمھارے بابا کی نظر مجھ پر پڑی اور انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر دادِ شجاعت دی تھی۔

میں نے آپ کے بابا کا نام بچپن سے سن رکھا تھا اور ان کے جنگی کارناموں سے واقف تھا لیکن میں نے کبھی انھیں دیکھا نہیں تھا۔ بعد میں جب مجھے اپنے علاقے کے ایک ساتھی جنگجو کی زبانی پتہ چلا کہ وہ خانی زمان خان ہیں، تو مجھے رشک آنے لگا کہ مجھے ایک بہادر اور آزمودہ جنگجو، جس نے مجھیٹیہ جیسے ایک بڑے سپہ سالار کو، اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے تو میرے جنون میں مزید اضافہ ہوگیا اور میں پہلے سے بڑھ کر حملے کرنے لگا۔ جب انھوں نے دوبارہ بلا کر مجھے داد دی تو مجھے پہلے سے بڑھ کر خوشی محسوس ہوئی کیوں کہ اب میں جان چکا تھا کہ مجھے دادِ شجاعت دینے والا کون ہے اور میں نے، ان کے چہرے کی طرف پہلی بار اتنے غور سے دیکھا کہ شاید میں نے اتنے غور سے کبھی اپنے لکڑباز نانا اور ماں کے چہرہ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ ان کے خط و خال میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے اور آج تک نقش ہیں۔

اس دن جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ کے چہرے کے خط وخال میں، مجھے آپ کے بابا کی جھلک دکھائی دی؛ لیکن شروع میں، میں شک میں تھا۔ بعد میں جب میں نے آپ کو کھنڈر حویلی میں ہر چیز کو انہماک سے دیکھتے ہوئے دیکھا تو میرا شک یقین میں تبدیل ہوگیا کہ میں نے سن رکھا تھا کہ آپ کے بابا کو یہ کھنڈر بہت پسند تھا، جسے میں نے ان کے والد کی چلہ گاہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن میں نے اس وقت آپ کو دیکھ کر، اس لیے نظریں چرالی تھیں کہ میں جانتا تھا کہ اگر آپ کو پتہ چل گیا کہ کسی نے آپ کو پہچان لیا ہے تو آپ کسی بہانے یہاں سے بھاگ جائیں گے کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اس غدار ناظم خان کا قتل آپ ہی نے کیا ہے۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے حقے کا ایک گہرا کش لیا اور میرے چہرے کی طرف بغور دیکھا، جیسے میرا ردعمل دیکھنا چاہ رہا ہو۔ میں اس کی اس باخبری پر سٹپٹا سا گیا۔ اس کی نشے سے سرخ انگارہ آنکھیں، بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے، جیسے میرے دل میں جھانک لیا تھا اور میری بے چینی کو بھانپ لیا تھا۔

''میں خود بھی ایک جنگجو رہا ہوں اور بخوبی جانتا ہوں کہ کون شخص اس حد تک جا سکتا ہے۔'' وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''جب اس جندروئی کو طلب کیا گیا، جس کے جندر کے قریب آپ نے ناظم خان کو قتل کیا تھا تو اس نے تھانے میں یہ بیان دیا تھا کہ ایک نوجوان اس واقعے سے مہینہ بھر قبل، میرے جندر پر آیا تھا۔ اس کے پاس ایک بوسیدہ پگڑی ایک پرانی تلوار اور ایک کتاب بھی تھی اور اس نے اپنے آپ کو بگڑہ کا رہائشی قرار دیا تھا۔ اس کے بقول اس نے اسے اپنے پاس تین روپے مہینہ پر نوکر رکھ لیا تھا لیکن وقوعے کی رات، وہ وہاں سے غائب ہوگیا تھا۔

اس نے اس بات کی بھی تصدیق کی تھی کہ مری کی بغاوت سے تین ماہ قبل، وہ اپنے چچا کے ساتھ یہاں سے کوہِ دناہ کی طرف گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب میں نے اس سے بگڑہ میں اپنے جاننے والوں کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے غلط نام بتائے تھے۔ مجھے شک تو ہوگیا تھا کہ وہ وہاں کا

رہائشی نہیں ہے۔ پہلی رات وہ جندر پر رات گزار کر اور اپنی ایک پرانی تلوار میرے پاس رکھوا کر کوہِ دناہ کی طرف چلا گیا تھا کہ اسے واپسی پر لے جاؤں گا۔

جب وہ اگلے روز جندر پر آیا تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ مجھے نوکر رکھ لیا جائے تو میں نے اسے گھر سے بھاگا ہوا نوجوان سمجھ کر ملازم رکھ لیا تھا؛ لیکن مجھے اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ وہ سرکار کے ایک وفادار کو، جسے اعزازی شمشیر بھی دی جا چکی ہے، قتل کرنے کی جرات کرے گا۔ جب اس سے آپ کا حلیہ پوچھا گیا تو اس نے آپ کے جو خط وخال بتائے اس سے پولیس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ناظم خان کا قاتل صرف اور صرف خانی زمان خان کا مفرور بیٹا ہی ہو سکتا ہے۔

اس واقعے کی ابتدائی رپورٹ تو دناہ کے تھانے میں کاٹی گئی تھی لیکن جوں ہی آپ کے بابا کے ڈیرے میں تھانہ قائم ہوا، یہاں جو رپورٹ سب سے پہلے درج ہوئی وہ آپ ہی کے خلاف تھی۔ یہ رپورٹ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، جب میں اٹھائیس سال پہلے، مری میں ہونی والی بغاوت میں شریک ہونے کے الزام میں، پہلی بار گرفتار ہوا تھا۔

مجھے کئی دن تک زیرِ تفتیش رکھا گیا لیکن جرم ثابت نہ ہو سکا، سو رہا کر دیا گیا تھا؛ رہائی کے بعد میں پہلی دفعہ اس جگہ آیا تھا، جہاں ان دنوں آپ کے دادا کی قبر پر کنجور کا مقبرہ تھا۔ میں نے پہلی رات یہاں ، آپ کے دادا کی قبر پر گزاری تھی۔ اس رات آپ کے دادا میرے خواب میں آئے، وہ مجھے لے کر کسی ویران کھنڈر میں چلے گئے، وہاں ہم دونوں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اگلی صبح جب میں واپسی کے لیے یہاں سے نیچے اترنے لگا تو میں رستہ بھول کر، غلطی سے اس کھنڈر میں اتر گیا تھا، جو رات کو خواب میں دیکھے ہوئے کھنڈر سے ملتا جلتا تھا اور اسی لمحے میں نے یہیں ایک ملنگ کے روپ میں رہنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

میں کئی روز تک یہاں اکیلا لیٹا رہا اور جنگلی پھلوں پر گزارا کرتا رہا۔

کئی دن بعد ایک شخص نے، جو ایک بکروال تھا، مجھے یہاں، مقبرے کی احاطے میں جھاڑو دیتے ہوئے دیکھا اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگا تو میں نے اسے اپنے دیکھے ہوئے خواب میں ردو بدل کر کے بتایا کہ کچھ دن پہلے مجھے خواب میں اشارہ ملا کہ صاحب قبر ایک بہت بڑے ولی ہیں، اگر تم دل کی

مرادیں بھرلانا چاہتے ہوتو یہاں آ کے جھاڑو دو۔میں اس الہامی بشارت کی تعمیل میں دور دراز کا سفر کر کے یہاں آیا ہوں تو اس نے مجھے اپنی بھیڑوں کا دودھ پیش کیا۔میں نے تو یہ چھپانے کے لیے کہ اسے، اس بات کا پتہ نہ چل جائے کہ میں کوئی ملزم ہوں، جھوٹ گھڑا تھا لیکن اگلے روز اس کے ساتھ کئی اور بکر وال یہاں حاضری دینے آئے تو مجھے حیرت ہوئی۔انھوں نے ہی بعد میں مجھ سے، یہاں لنگر خانہ کھولنے کی درخواست کی، تا کہ لوگ اس سے فیض یاب ہوسکیں۔

پھر انھی کی مہربانی سے یہ سلسلہ چل نکلا اور آہستہ آہستہ یہاں لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ تین چار سال تک چلتا رہا۔ایک دن یہاں ایک شخص آیا۔وہ اپنے حلیے سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ دکھائی دیتا تھا۔میں نے اسے اپنا خواب سنایا تو وہ حیران ہوا۔جب میں نے اسے بتایا کہ صاحب مزار، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے ساتھ بالاکوٹ کی جنگ میں سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے اور ان کی تدفین بھی وہیں ہوئی تھی؛ کئی ہفتوں بعد ان کے بیٹے کو، جنھیں انگریز سرکار نے بعد میں بغاوت کے جرم میں توپ سے اڑا دیا تھا،خواب میں بشارت دی گئی تھی کہ ان کے جسد خاکی کو یہاں منتقل کیا جائے اور انھوں نے اس بشارت کی تعمیل میں انھیں یہاں لا کر دفن کیا تھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔

اسی نے اس مزار کی تعمیر شروع کرائی۔ یہاں عرس منانے کا آغاز بھی اسی نے کیا، جو آج بھی جاری ہے۔اس کا سارا خرچہ وہ ایک عرصے تک اپنی جیب سے ادا کرتا رہا۔آہستہ آہستہ دوسرے لوگوں نے بھی اس میں حصہ ڈالنا شروع کر دیا۔زائرین کی آمدورفت بڑھ گئی اور یہاں نذر نیاز کا سلسلہ چل نکلا۔اب وہ صرف عرس کے موقع پر لنگر کا خصوصی بندوبست کرتا ہے۔لنگر کے باقی معاملات سال بھر یہاں آنے والے زائرین کی بدولت،خدا کے فضل وکرم سے چلتے رہتے ہیں۔

تیسرے عرس کے موقع پر اس نے کھنڈر حویلی دیکھی اور مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر اسے سنائی کہ یہاں صاحب مزار چلہ کشی کرتے تھے۔یہ سنتے ہی اس نے کہا کہ کسی قریبی بستی سے مزدور بلا کر لاؤ۔میں اس مقدس جگہ کو فوراً زائرین کے لیے محفوظ کرانا چاہتا ہوں۔

میں اگلی ہی صبح کچھ مزدور بلا لایا۔اس نے اپنی نگرانی میں جھاڑیاں صاف کرائیں؛ اندر گرے ہوئے پتھروں سے حویلی کی نامکمل دیواروں کو مکمل کرا کر کمروں پر چھتیں ڈلوائیں؛ فرش ہموار کرایااور کمروں میں دیے جلانے کی رسم شروع کرائی۔اسی نے یہ مختصر کتب خانہ بنوا کر بالاکوٹ کے ایک آدمی سے،جس کے پاس شاہ اسماعیل دہلوی کی کتب کا ذخیرہ تھا،یہ کتابیں خرید کر یہاں رکھوائیں؛ ہر کمرے میں قرآن پاک کے نسخے بھی رکھوائے تا کہ لوگ یہاں بیٹھ کر عبادت کر سکیں۔اب مزار پر آنے والے زائرین یہاں بھی سلام کرنے آتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھ کر قرآن پاک پڑھتے اور آپ کے دادا کو ایصال ثواب کرتے ہیں۔

اگر آپ اجازت دیں تو اگلے ماہ شروع ہونے والے عرس کے موقع پر جب وہ آئے تو میں آپ کا اس سے تعارف کراؤں؟ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوگا۔''

عبدل نے،جس کی آنکھیں نشے کے باعث انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں،میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔''،میں نے اس کی دہکتی آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کی باتوں سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔شاید اس نے میرے اس خوف کو بھانپ لیا تھا؛ وہ اٹھااور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

بائیس

میں نے اس چلہ گاہ کے کتب خانے میں بیٹھے ہوئے، جہاں مہتاب سنگھ کی لکھی ہوئی اُس تاریخ کا ایک نسخہ موجود ہے، جس کے جواب میں بابا نے اپنا نوشتہ ترتیب تھا، کئی مرتبہ سوچا تھا کہ بابا کا وہ نوشتہ، جسے میں بغل میں دابے پھرتا رہا ہوں، اور ہر لمحے مجھے یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں میں اپنے آبا کی اس تاریخ کو گم نہ کر بیٹھوں، جسے میں نے بابا کی وصیت کے مطابق، آئندہ نسلوں کو منتقل کرنا تھا، غلاف چڑھا کر، انھی کتابوں میں کہیں رکھ دوں کہ بابا کے بابا سے منسوب یہ کتب خانہ ہی اس کا بہترین مصرف ہے، لیکن پھر اس خوف کے باعث کہ اگر اس پر انگریز کے کسی وفادار کی نظر پڑ گئی تو میرے اور عبدل کے ساتھ ساتھ، اس پورے کتب خانے کی شامت آجائے گی، ایسا کرنے سے باز رہا؛ تاہم بابا کی تلوار اور پگڑی کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ، میں نے اسی رات ڈھونڈ لیا تھا۔

اگلے ہی ہفتے دادا سے منسوب تبرکات والے کمرے میں، لگی تختیوں میں دو مزید تختیوں کا اضافہ ہو چکا تھا اور یہ تختیاں عبدل اپنے ہاتھ سے بنوا کر لایا تھا؛ ایک پر لکھا تھا:

''یہ وہ تلوار ہے جس سے حضرت سید محمد خان رحمۃ اللہ علیہ نے جنگ بالاکوٹ میں سکھوں کے کئی سورماؤں کو واصل بہ جہنم کیا تھا؛ اس کی میان بعد ازاں اسی گھوڑے کے چمڑے سے بنوائی گئی تھی جس پر سوار ہو کر وہ دشمن کے مدمقابل ہوئے تھے۔''

دوسری تختی پر درج تھا:

''یہ حضرت کی وہی پگڑی ہے جسے پہن کر حضرت سید محمد خان رحمۃ اللہ علیہ میدان جنگ میں نکلے

تھے۔شہادت کے بعد انھیں بالاکوٹ میں اس پگڑی سمیت دفنا دیا گیا تھا،کافی عرصے بعد جب ان کی میت یہاں منتقل کی گئی تو یہ پگڑی اسی طرح نویں نکور تھی،انھیں دوبارہ نیا کفن پہنا کر اس مقدس پگڑی کو محفوظ کرلیا گیا تھا۔"

یہ چلہ گاہ، جو پہلے کھنڈر حویلی کہلاتی تھی اور میرے بابا کو یہاں سے اپنے اجداد کی خوشبو آتی تھی،اب ہر وقت اگربتیوں کی خوشبو سے اٹی رہتی ہے۔ بابا کو آنے والی خوشبو، اگربتیوں کی اس خوشبو سے کس حد تک مختلف تھی، میں اس کے بارے میں، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرے نتھنے صرف اگربتیوں کی خوشبو سے آشنا ہیں۔

گیارہ سال پہلے میری یہاں آمد کے کچھ دن بعد یہاں پڑنے والے چھاپے میں جب دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا اور پاگل سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا؛ رات کے پچھلے پہر تھانے سے واپسی پر چلہ گاہ میں قدم رکھتے ہی اچانک مجھے وہم ہوگیا تھا کہ کسی بھی لمحے میرے وجود کے کھنڈر سے،کسی کو میرے اجداد کی خوشبو آسکتی ہے،جس کا بھگتان مجھے موت کی صورت میں بھگتنا ہوگا؛ یہ وہم چھ سال تک میرے وجود کو دیمک کی طرح چاٹتا رہا تھا۔

آخر کار چھے سال پہلے کی ایک رات میں نے اس وہم سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کرلیا۔

تیئیس

چھے سال پہلے کے جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ وہی دن تھا، جب سپاہیوں نے ایک بھاری نفری کے ساتھ یہاں دھاوا بولا تھا اور ان کی آمد کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اچانک اُس نوشتے کا خیال آیا تھا، جو ان دنوں ہر وقت میرے سرھانے پڑا رہتا تھا۔ اس روز ان کی آمد اتنی غیر متوقع تھی کہ عبدل کو، مجھے ان کی آمد کی اطلاع دینے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا اور وہ مجھے بخار میں پھنکتا ہوا چھوڑ کر، دوسرے لوگوں کے ساتھ فرار ہو گیا تھا۔

اس رات، پچھلے پہر جب عبدل کاندھے سے پانی کا مشکیزہ لٹکائے اور کھچڑی کی کٹوی ہاتھ میں پکڑے، چلہ گاہ کے اسی کمرے میں، جہاں میں لیٹا ہوا ہوں، داخل ہوا تھا اور مجھے پانی پلانے اور کھچڑی کھلانے کے بعد، میرے لیے پودینے اور خشخاص کا قہوہ بنا رہا تھا، میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر چکا تھا۔

اگلے روز جب میں نے عبدل کو اپنے گذشتہ رات کے فیصلے سے آگاہ کیا کہ میں وہ لواخ؛ جو جنگ ناڑہ کے بعد، سینتالیس سال سے بجھا پڑا ہے، اماوس کی رات، دوبارہ روشن کروں گا تو وہ کافی دیر تک میری آنکھوں میں یوں حیرت سے دیکھتا رہا تھا، جیسے ان میں اپنے لیے شناسائی کی جھلک تلاش کر رہا ہو۔ اسے کامل یقین ہو چکا تھا کہ میں پاگل پنے کا ڈھونگ رچاتے رچاتے مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہوں، لیکن جب میں اس کی حیرت پر مسکرایا تو اسے میری صحیح الدماغی کا تھوڑا بہت یقین آیا؛ اس حد تک کہ وہ یہ پوچھنے کے قابل ہوا: ''آپ پاگل تو نہیں ہو گئے'' اور اس کے اسی سوال سے مجھے بھی یقین آیا کہ وہ

لواخ

مجھے پاگل نہیں سمجھ رہا کہ منطق کا طالب علم ہونے کے ناطے، میں اس بات سے آگاہ تھا کہ ایسا سوال؛ کوئی باشعور شخص، کسی ایسے شخص ہی سے کرسکتا ہے، جس کی ذہنی صحت پر اسے شک نہ ہو۔

جب اسے یقین ہوگیا کہ میں پورے ہوش وحواس میں ہوں تو پہلے وہ سمجھا کہ میں اسے چونکانے کے لیے، اس کی محبوبہ مہتاب کور کی طرح، اس سے مذاق کر رہا ہوں، مگر جب اسے لگا کہ میں اس بابت سنجیدہ ہوں تو اس نے فوراً سوال داغا : مگر کیوں؟

میں نے اسے بتایا تھا کہ بابا نے اپنی زندگی کے آخری محاذ پر جانے سے پہلے کہا تھا کہ ہم نے لواخ روشن ہونے کے معنیٰ بدل دیے ہیں؛ اب اس کا روشن ہونا، جوابی حملے کی تیاری کے بجائے فتح کی خوش خبری ہوگا اور یہ کہ میری خواہش ہے کہ اس نئے معنی کی ترویج، تم اسے اپنے ہاتھوں سے روشن کر کے کرو، لیکن وہاں سے فتح کی خوش خبری کے بجائے بابا اور ان کے ساتھیوں کو توپ سے اڑائے جانے کی خبر آئی تھی، جس کی وجہ سے میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کرسکا۔ اب جب کہ میں خود بھی بڑھاپے کی دہلیز سے آلگا ہوں میری تمنا ہے کہ میں ان کی یہ خواہش پوری کر دوں۔

''لیکن اب اس کے جلانے کا مقصد کیا ہوگا۔'' اس نے فوراً اگلا سوال داغا تھا۔

''میں اسے نئے معانی پہنانا چاہتا ہوں۔'' میں نے عبدل کی حیرت بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کون سے معانی؟'' وہ چونک اٹھا تھا۔

''لواخ کا بلاوجہ جلنا ہی اس کا نیا معنی ہوگا۔'' میں نے کہا۔ یہ سنتے ہی اس نے دوبارہ مجھے یوں دیکھا، جیسے اسے میرے پاگل ہونے میں کوئی شک نہ رہا ہو۔

''آپ جانتے ہیں کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟'' اس نے میری آنکھوں میں شناسائی کی رمق تلاش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں۔ جانتا ہوں۔ وہ مجھے گرفتار کرلیں گے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے پاگل سمجھ کر ایک مرتبہ پھر چھوڑ دیں گے، بلکہ جن سپاہیوں کو پچھلی دفعہ میرے پاگل پن کا یقین نہیں آیا تھا، وہ بھی مجھے پاگل

سمجھنے لگیں گے۔'' وہ یہ سن کر مسکرانے لگا تھا۔

''آپ واقعی پہنچے ہوئے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے لواخ روشن کرنے کے تمام ضروری اقدامات اپنے ذمے لے لیے۔

جنگوں کے زمانے میں جب بھی کسی طرف سے حملے کا خطرہ منڈلاتا، چیڑ کا کوئی نہ کوئی درخت گرا دیا جاتا تھا تاکہ اس کے تنے سے دلھیاں حاصل کر کے لواخ روشن کیا جا سکے۔ عام لکڑی نہ تو فوراً آگ پکڑتی ہے اور نہ ہی اس کا شعلہ اتنا بلند ہوتا کہ وہ میلوں دور سے نظر آسکے۔

لواخ کے شعلے صرف غروب آفتاب کے بعد ہی مطلوبہ نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر ممکنہ حملے کی خبر دن کے کسی پہر پہنچے تو لکڑیوں اور دلھیوں کی مشعلوں پر چیڑ کی دنبالہ دار سبز ٹہنیاں پھینک دی جاتی تھیں تاکہ ان کا دھواں آسمان سے باتیں کرتے ہوئے دور دراز کی بستیوں کو ممکنہ حملے سے خبر دار کر سکے۔

عبدل اگلے ہی روز صبح سویرے ایبٹ آباد روانہ ہو گیا؛ عشا کے وقت جب وہ واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں چیڑ کے، اُس درخت کو کاٹنے کا اجازت نامہ تھا، جو لواخ سے سو گز کے فاصلے پر میدان کے نشیب میں واقع تھا اور لواخ کے تھلے پر بیٹھ کر اگر بالکل سیدھ میں تیر کا نشانہ باندھا جائے تو وہ اس کی دنبالہ دار سب سے بلند پھننگ کو چھوتا ہوا گزر جائے۔

انگریز سرکار نے ہمارے علاقے میں، چیڑ، بیاڑ اور دیودار کے درخت کاٹنے پر، چاہے وہ آپ کی ذاتی جگہ پر ہی کیوں نہ اُگے ہوں، پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذاتی جگہ سے، کوئی درخت اپنی کسی ضرورت کے لیے کاٹنا چاہتا ہے تو اس کے لیے خصوصی اجازت نامہ ضروری ہے، جسے دفتر میں پرمٹ کہا جاتا ہے؛ یہ پرمٹ ضلع کچہری سے حاصل کر کے محکمہ جنگلات کے متعلقہ دفتر میں جمع کرانا پڑتا ہے، بصورت دیگر ان درختوں کو کاٹنا قابل دست اندازیِ قانون ہے۔ باقی کسی بھی درخت کے کاٹنے پر، بشرطے کہ وہ سرکاری جنگل میں نہ ہو، کوئی پابندی نہیں۔

پرمٹ ہاتھ آتے ہی، اس نے لنگر خانے کے ایک دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر چیڑ کا مذکورہ درخت کٹوا کر، اس کے تنے کو کلھاڑی سے چیروایا اور لواخ کے قریب ان کا ٹال سا بنا دیا اور رہم اماوس کی

رات کاانتظار کرنے لگے۔

۞

اماوس کی جس رات لواخ روشن کیا جانا تھا،مغرب سے تھوڑا پہلے،عبدل،یہیں اسی کمرے میں،میرے پاس آیااوراس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنایہ فیصلہ واپس لےلوں۔

''ہوسکتا ہے انگریز آپ کو گرفتار کر کے بغاوت کے مقدمے میں پھانسی چڑھادیں؛وہ ہماری صدیوں کی اس روایت سے واقف ہیں کہ لواخ کے روشن ہونے کا مطلب حملے کی تیاری ہے۔''وہ کچھ سہما ہوا سا لگ رہا تھا۔

''تم اطمینان رکھو۔مجھے وہ کچھ نہیں کہیں گے؛سوائے پاگل کہنے کے۔ہاں تم خود جا کرمیرے خلاف مقدمہ درج کرانا کہ میں نے لنگر خانے کے لیے چیڑ کا درخت،سرکار کی خصوصی اجازت سے کٹوایا تھالیکن اس پاگل نے وہ ساراجلادیا۔یہ لواخ اب ہر حالت میں روشن ہوگا کہ میں نے اس کے مفہوم میں،اپنے معنی داخل کر دیے ہیں؛وہ معنی جومیرے بابا کے تو کیا،حسن علی خان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوں گے۔''میری باتیں،اس کے سر سے گزر گئیں اور وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔کافی دیر تک کمرے پر سکتی خاموشی کا خوف طاری رہا۔

''آج کی رات چانداور سورج کے ملاپ کی رات ہےلیکن میری اپنے ماضی سے جدائی کی۔'' میں نے سوچا۔

جب سکتی خاموشی کو اندھیرا کاٹنے دوڑا تو میں اٹھ کر اس کمرے میں گیا جہاں دادا سے منسوب تبرکات رکھی گئیں تھیں۔بابا کی پگڑی اور تلوار،جواب دادا سے منسوب ہو چکی تھیں،اٹھائیں؛پگڑی سر پر رکھی اور تلوار اپنی گردن میں حمائل کر کے واپس اسی کمرے میں گیا جہاں عبدل بیٹھا ہوا تھااور نوشتے اٹھاتے ہوئے عبدل سے کہا؛چلیں۔

''لگتا ہے آج آپ محاذ سے سرخرو ہی لوٹیں گے۔''اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

ہم دونوں نے چلہ گاہ کا پتھریلا،زینہ عبور کیااور میدان میں داخل ہو گئے۔عبدل آگ لینے لنگر

لواخ

خانے میں داخل ہوگیا اور میں وہیں ٹہلنے لگا۔ میں نے مغرب کی طرف دیکھا تو ڈبران کی چوٹی سے پرے افق پر شفق کی مدھم سی لکیر تیر رہی تھی، جو تھوڑی ہی دیر میں غائب ہونے والی تھی۔

عبدل واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں انگاروں بھری ٹھیکری تھی۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے، لواخ پر پہنچے۔ چیڑ کی لکڑیاں جو گزشتہ اٹھارہ بیس دنوں میں ہلکی ہلکی سوکھ چکیں تھیں، ہم نے لواخ میں جھونکیں اور ان کی درزوں میں چیڑ کی دلھیاں ٹھونس کر اندھیرا مزید گہرا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

جب ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دینے لگا تو میں نے عبدل سے کہا کہ وہ انگارے تازہ کرے۔ اس نے پہلے ٹھیکری میں پھونک مار کر انگارے تازہ کیے اور پھر ان پر دلھی کی نوک رکھ کر ٹھیکری میرے منہ کے قریب کی، جیسے مجھ سے دم کروانا چاہ رہا ہو۔ میں نے جوں ہی پھونک ماری دلھی نے آگ پکڑ لی؛ جلتی دلھی، جب لکڑیوں کے بیچ میں ٹھونسی ہوئی دلھیوں میں رکھی گئی تو دوسری دلھیوں نے بھی فوراً آگ پکڑ لی۔ نیم خشک لکڑیاں آہستہ آہستہ سلگنے لگیں تاہم سردست ان کے شعلے لواخ کی دیواروں کے اندر رہی تھے۔ جب لکڑیاں اچھی طرح سلگ اٹھیں تو عبدل نے دلھیوں کا ایک بڑا گٹھڑا اٹھایا اور اسے لواخ میں جھونک دیا، اگلے ہی لمحے شعلے آسمان کو چھونے لگے۔

میں عبدل سے نظریں بچا کر، جلدی سے اٹھا اور اُس چٹان کی طرف بڑھا، جہاں میں نے اپنا تھیلا، کاندھے سے اتار کر رکھا تھا۔ چٹان پر کھڑے ہو کر میں نے لواخ کا نشانہ لیا اور تھیلے کو لواخ کی طرف اچھال دیا۔ تھیلے کو ہوا میں اڑتا دیکھ کر عبدل کی چیخ سی نکل گئی اور اس نے بدحواسی میں اچھل کر اسے پکڑنے کی کوشش کی تا کہ وہ اسے آگ میں گرنے سے بچا سکے لیکن وہ ناکام رہا۔

''یہ کیا کیا آپ نے۔۔۔'' وہ غصے میں چلایا۔ ''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ آپ یہ کرنے جا رہے ہیں تو بے شک آپ میری گردن بھی اتار دیتے تو بھی، میں اسے روشن نہ کرتا تھا۔'' اس نے کہا اور مجھے وہیں چھوڑ کر غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چل دیا۔

میں نے تلوار میان سے نکالی۔ میان کو بھی شعلوں کی نذر کیا اور تلوار کو گلو رنا بنا کر نوشتے اور میان کو الٹنے پلٹنے لگا تا کہ ان کے وہ حصے جو ابھی شعلوں کی لپیٹ میں نہیں آسکے، آگ پکڑ سکیں۔

لواخ

میں اس وقت تک وہیں لواخ کے کنارے بیٹھا رہا جب تک مجھے یقین نہیں ہوگیا کہ بابا کے ہاتھوں سے لکھا ہر لفظ آگ کا ایندھن بن چکا ہے۔سب سے سخت جان، عمر گل صاحب کے رعشہ دار ہاتھوں سے، بابا کے محبوب گھوڑے کے چمڑے پر کھدا ہوا سر نامہ اور میان نکلی؛ جنھیں راکھ میں تبدیل ہوتے ہوئے خاصی دیر لگی۔

جب نوشتہ چمڑے کی جلد سمیت جل کر مکمل طور پر راکھ ہو چکا تو مجھے لگا میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے، جسے میں گذشتہ تینتیس برسوں سے اٹھائے پھر رہا ہوں۔وہ سارے کردار جو میرے حال کو ماضی سے منسلک کیے ہوئے تھے اور میرے زخموں کو تازہ کرتے تھے، یک دم میری آنکھوں سے غائب ہونا شروع ہو گئے۔ان کرداروں کے ذہن سے محو ہوتے ہی میری یادداشت میں موجود، ناظم خان کی آنکھوں میں منجمد موت کے سائے نے، جس سے جان چھڑانے کے لیے میں نے ایک عرصے تک یوگ اور مراقبوں کے جتن کیے تھے، اچانک ہلکی سی حرکت کی اور اس کی آنکھوں سے یوں غائب ہوگیا جیسے اس کا وہاں موجود ہونا میرا واہمہ ہو۔میں نے بابا کی تلوار جو، اب گلو رنے میں تبدیل ہو چکی تھی، وہیں لواخ میں پھینکی اور واپس چلہ گاہ کی طرف چل دیا۔

اس واقعے کو گزرے آج چھٹا سال ہے۔بابا کی وہ پگڑی، جسے میں نے دانستہ لواخ کی نذر نہیں کیا تھا کہ اِس کا، اُس سے کہیں بہتر مصرف میرے ذہن میں موجود تھا، اب بھی میرے دائیں پہلو پڑی ہوئی ہے۔اس کا کپڑا تو لیر و لیر ہو چکا ہے لیکن اس کی ٹوپی اب بھی میرے رزق کا وسیلہ ہے کہ اس میں روز کوئی نہ کوئی سکہ گرتا رہتا ہے اور عرس کے دنوں میں تو یہ لبالب بھر جاتی ہے۔

❁

کچھ عرصہ پہلے جب مردم شماری والے یہاں آئے اور انھوں نے مجھ سے میرا نام، قوم اور پیشہ پوچھا تو میں نے انھیں اپنا نام مستانہ خان ولد منگتا خان، قوم فقیر اور پیشہ گداگر لکھوا دیا ہے۔